إِنْ أُرِيْدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

اگست ۲۰۱۴ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ **البرہان** لاہور

جلد ۱۸، شمارہ ۸، اگست ۲۰۱۴ء/شوال ۱۴۳۵ھ

مشمولات

○فکر و نظر

دو مونہا سانپ ۴

○پاکستانی سیاست مدیر

آزادی مارچ و انقلاب مارچ: دروس و عبر ۶

○تعلیم و تربیت

دینی حلقے تعلیم کو ترجیح اول کیوں نہیں بنا سکے؟ ڈاکٹر محمد امین ۷

انگلش میڈیم کی سفاکی مکالمہ محسن فارانی ۱۲

ابتدائی بچپن کی تعلیم عزیز احمد مرزا ۱۵

پاکستان کے قومی نظام تعلیم کی تشکیل میں ناکامی پروفیسر ملک محمد حسین ۲۲

علم الاسماء (۲) چوہدری رفاقت علی ۲۷

○دینی منہج

غلبۂ دین کا صحیح منہج ـ دعوت یا جہاد؟ مکالمہ ڈاکٹر محمد امین ۳۶

موجودہ ادارتی ڈھانچے کے ذریعے اسلام آ ہی نہیں سکتا عمر جاوید ۴۱

اصلاح معاشرہ ـ منہج اور طریق کار مفتی محمد اصغر ۴۹

اعتراض سے اعتراف تک کا سفر مکالمہ محمد رشید ۵۲

○استفسارات

مدیر البرہان کا مسلک کیا ہے؟ مدیر ۵۸

فکر و نظر

دو مونہا سانپ

مغرب (اپنے حلیفوں سمیت) ہم مسلمانوں کے لیے دو مونہہ والا سانپ بن چکا ہے اور دونوں طرف سے ڈس رہا ہے لیکن ہم اپنی جہالت اور نادانی میں اسے آقا اور دوست سمجھتے ہوئے دودھ پلائے جا رہے ہیں۔ چند مناظر دیکھیے:

۔ امریکہ پاکستان میں قبائلیوں کو اسلحہ اور ڈالر دے رہا ہے کہ پاکستانی تنصیبات پر حملے کرو۔ دوسری طرف پاکستانی حکومت اور فوج کو اسلحہ اور ڈالر دے رہا ہے کہ یہ لوگ انتہا پسند اور دہشت گرد ہیں، ترقی اور جمہوریت کے دشمن ہیں، انہیں کچلو۔

۔ شام میں وہ حکومت مخالف لبرل اور سیکولر جنگجوؤں کو اسلحہ اور ڈالر دے رہا ہے تاکہ سچ مچ کے مجاہدین کہیں کامیاب نہ ہو جائیں اور دوسری طرف ایران اور حزب اللہ کو تھپکی دے رہا ہے کہ ان ریاست دشمنوں کا قلع قمع کرنے کے لیے بشار الاسد حکومت کو روپیہ، اسلحہ اور جنگجو دو۔

۔ اس نے مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے اپنی کامیاب سازشوں سے شیعہ سنی کو آپس میں لڑا دیا ہے ایک طرف وہ اہل التشیع کو اکثریت (عراق اور بحرین میں) اور حقوق (شام، پاکستان، سعودی عرب......وغیرہ) کے نام پر ابھارتا ہے اور دوسری طرف اس نے سنی سوادِ اعظم (Mainstream Islam) کے مزاحمت کار گروہوں کو اسلحہ اور ڈالر دے کر انہیں انتہا پسند اور دہشت گرد ثابت کر دیا ہے جس کی مثال طالبان، القاعدہ، داعش، بوکوحرام جیسے سنی گروپ ہیں۔ امام خمینی جب تک زندہ رہے مغرب کے جال میں نہ آئے لیکن ایران کی موجودہ حکومت شیعیت کے مفاد میں (اتحاد بین المسلمین کو بھول کر) اس کے ابلیسی جال میں پھنس گئی ہے اور امریکہ کا لاڈلا اسرائیل: عراق، ایران اور مرسی جیسے مخالفوں کے خاتمے کے بعد خود کو زیادہ محفوظ سمجھ رہا ہے۔

شیعہ سنی کشمکش کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ مغرب نے اپنی سازشوں سے سعودی عرب اور ایران کو بالمقابل لا کھڑا کیا ہے۔ چنانچہ اب ایران شام کی ظالم اقلیتی شیعہ حکومت کی مدد کر رہا ہے اور سعودی عرب شام کے سنّی مجاہدین کی۔ ایران بحرین کے شیعوں کی پشت پر ہے اور سعودی فوج بحرین کے (سنی) حکمرانوں کو بچانے کے لیے پہنچ چکی ہے۔ پاکستان میں ایران شیعہ گروپوں کی حمایت کر رہا ہے اور سعودی

عرب اور امارات ان کے مخالف گروپوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں چنانچہ دونوں میں خوب قتل و غارت ہو رہی ہے۔

۔ مغرب مسلمان ملکوں کو پہلے امن و آشتی کے لولی پاپ سے ڈستا ہے (جمہوریت، تعلیم، میڈیا، ادب، این جی اوز، خاندانی منصوبہ بندی، قرضے اور مالی امداد، سول و فوجی افسران کی تربیت...... وغیرہ وغیرہ) لیکن مسلمان 'امت' ذرا ڈھیٹ واقع ہوئی ہے (ہائے امت! ہاں! مسلمان بھی کبھی امت تھے۔ آج غزہ میں خاک و خون میں تڑپنے والے معصوم پوچھتے ہیں 'امت' کہاں ہے؟) ہاں! تو ہم کہہ رہے تھے کہ مسلمان امت ذرا ڈھیٹ واقع ہوئی ہے (کہ خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی) بعض اوقات ان زہروں سے نہیں مرتی تو مجبوراً ابلیسی سانپ کو اپنے دوسرے مونہہ کے ڈنگ کو حرکت میں لانا پڑتا ہے چنانچہ عراق اور افغانستان کا تورا بورا بنایا جاچکا ہے۔ شام اور لیبیا کا بن رہا ہے، پاکستان، یمن، مصر، مالی اور نائیجیریا پر حملے جاری ہیں جب کہ فلسطین، کشمیر، چیچنیا، منڈے ناؤ، اور اراکان کے مسلمان کب سے ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔

اے مسلمانو! جاگو، ہوش میں آؤ، اس دومونہے سانپ سے بچو۔

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنایئے۔

زرِاعانت سالانہ 400روپے تاحیات 5000روپے

نام............................ پتہ............................

فون............................

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ 136 نیلم بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور بھجوایئے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

پاکستانی سیاست

آزادی مارچ وانقلاب مارچ

دروس وعبر

آج ۲۲ اگست ۲۰۱۴ء کی شام کو جب پرچہ پریس جارہا ہے، اس وقت تک عمران خان کے آزادی مارچ اور طاہرالقادری کے انقلاب مارچ اوران کے دھرنوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا لہٰذا ہم ان پرایک عمومی تبصرے تک محدود رہیں گے۔

پاکستانی سیاست سیکولر ہوچکی اور عمران خاں بھی ایک سیکولر سیاست دان ہیں لیکن ہم ان کی اس ہمت وجرأت کو سراہتے ہیں کہ انہوں نے ملک میں رائج کرپٹ انتخابی نظام کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور 'سٹیٹس کو' توڑنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے (اللہ کرے کل کلاں یہ خبر نہ آجائے کہ ان کے پیچھے بھی کوئی 'قوت' تھی)۔ اس میں سبق ہے ان اسلامسٹوں کے لیے جو پچھلے ٦٦ سال سے ڈھچکوں ڈھچکوں اسلامی انقلاب کے لیے روایتی انداز میں کام کررہے ہیں اور کوئی فیصلہ کن اقدام کرنے کی نہ ان میں صلاحیت ہے نہ جرأت۔

جہاں تک طاہرالقادری صاحب کا تعلق ہے وہ ہمارے نزدیک مرفوع القلم ہیں کہ ان جیسے نفسیاتی مریض پر تنقید اوران کی مذمت میں الفاظ کا ضیاع ہم مناسب نہیں سمجھتے۔ تاہم دین کے طالب علموں اور اس معاشرے کو اسلامی بنانے کی خواہش رکھنے والوں کو دو باتیں نوٹ کرنی چاہئیں:

ایک: یہ شخص کس طرح 'مصطفوی انقلاب' سے دست بردار ہوکر 'انقلاب' تک پہنچا اور اسلامی اصطلاحات چھوڑ کر سیکولر اصطلاحات میں بات کرنے لگا۔ وہ دوسرے لوگ بھی جو اُٹھتے بیٹھتے 'اسلامی انقلاب' کے نعرے لگایا کرتے تھے وہ اب اس نعرے کو چھوڑ کر تقدس مآب 'جمہوریت' کو ڈی ریل ہونے سے بچانے پر اپنی ساری توانائیاں لگائے ہوئے ہیں۔ یہ ہے مغربی فکر وتہذیب کا سحر اور ذہناً اس کی بالادستی کو تسلیم کرنے کا نتیجہ کہ اہل دین کے لیے ان کی اصطلاحات پر جمے رہنا بھی ممکن نہیں رہا۔

دوسرے: محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جو انقلاب لائے تھے اس کی بنیاد **'یعلمهم الکتاب والحکمه ویزکیهم'** کی اساس پر فرد کی تعمیر تھی۔ مغربی تہذیب نے بھی پہلے اپنے آدمی کو بدلا پھر اجتماعی انقلاب آیا...... بلکہ ہر انقلاب ایسے ہی آتا ہے خواہ وہ لینن کا بالشویک انقلاب ہو یا موزے تنگ کا ثقافتی انقلاب لیکن ایک یہ ہمارے بونے اور بڑھک باز رہنما ہیں جو اقتدار کی خواہش میں 'انقلاب' کے نعرے لگا کر 'اسلامی انقلاب' لانا چاہتے ہیں۔ یہ فکرونظر اور عمل وکردار کی پستی کی انتہا ہے کہ انقلاب جیسا بڑا لفظ بولنے والا اتنے کردار کا حامل بھی نہیں کہ قرآن کے الفاظ میں اس پر ایک دھیلے کا بھی اعتماد کیا جاسکے۔ فاعتبروا یااولی الابصار۔

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد امین

دینی حلقے تعلیم کو ترجیح اول کیوں نہیں بنا سکے؟

تبلیغی جماعت، دینی مدارس اور جماعتِ اسلامی کے مناہج کا ایک فکری تجزیہ

سوال: میں جماعت اسلامی کا ایک کارکن ہوں اور شعبۂ تعلیم سے وابستہ ہوں۔ سکولوں کے اسلامی کردار کے حوالے سے جو بحث ان دنوں البرہان میں چل رہی ہے، اس میں آپ کا موقف میں نے غور سے پڑھا ہے اور مجھے اس میں وزن محسوس ہوتا ہے۔ آپ نے جولائی والے مضمون کے حاشیے میں اس طرف اشارہ کیا ہے لیکن وضاحت نہیں کی لہٰذا میں اس بارے میں آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں کہ کیوں دینی جماعتیں خصوصاً جماعت اسلامی تعلیم کی اسلامی تناظر میں اصلاح اور اس کے ذریعے انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل و تعمیر کو اپنی بنیادی ترجیح نہیں بنا سکی؟ اور اسی طرح مغربی فکر و تہذیب کی شناعت کے بارے میں آپ کی اور دینی جماعتوں اور جماعت اسلامی کے لوگوں کی اپروچ میں جو فرق محسوس ہوتا ہے، آپ کے نزدیک اس کا سبب کیا ہے؟ (عبداللہ، پشاور)

جواب: ہم آپ کے سوال بلکہ سوالوں کا مختصر جواب دینے کی کوشش کریں گے:

ہمارے معاشرے میں دین کے تعلیمی، دعوتی و اصلاحی پہلوؤں پر کام کرنے کے سلسلے میں ایک معروف نام تبلیغی جماعت کا ہے۔ جو ایک بڑی اور عالمگیر تحریک بن چکی ہے اور بلاشبہ موثر ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس جماعت نے اپنا دائرۂ کار محدود رکھا ہوا ہے اور وہ دین کے سارے شعبوں (خصوصاً معاملات یعنی معیشت، معاشرت، سیاست، قانون، تعلیم ......وغیرہ) سے اعتناء نہیں کرتی۔ جو کام وہ کرتی ہے اس میں وہ موثر ہے اور جو کام وہ نہیں کرتی ان کے بارے میں ہم (اور ہم جیسے کئی اور لوگ بھی) تبلیغی جماعت کی توجہ اس طرف مبذول کرا چکے ہیں لیکن انہیں زیادہ کامیابی نہیں ملی۔

دوسرا دائرہ دینی مدارس کا ہے۔ دینی مدارس کے علماء کرام سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے کہ دین کیا ہے؟ لیکن اس کے باوجود وہ دنیاوی تعلیم یا عصری تعلیم سے اعتناء نہیں کرتے۔ نہ وہ اپنے اداروں میں عصری علوم کی تعلیم دیتے ہیں اور نہ عصری تعلیم کے لیے الگ تعلیمی ادارے قائم کرتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ بارہ سو سال تک مسلمانوں کا تعلیمی نظام 'وحدت تعلیم' کے تصور کے مطابق کرتا رہا ہے اور 'دینی تعلیم' الگ اور 'دنیاوی تعلیم' الگ ہماری تعلیمی و تہذیبی روایت کا کبھی حصہ نہیں رہی۔ اگرچہ پہلے بھی اس کا کوئی جواز نہ تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور شیخ الہند مولانا

محمود حسنؒ اپنے طلبہ کی عصری علوم کی تدریس سے متعلق نہ صرف فکر مند رہے ہیں بلکہ اس کے لیے انہوں نے عملی کوششیں بھی کیں اور علی گڑھ کے قریب آنے کی کوشش کی......لیکن قیام پاکستان کے بعد تو عصری تعلیم نہ دینے اور صرف مذہبی تعلیم کے ادارے قائم کرنے کا کوئی جواز نہ تھا کہ اب وہ آزاد مسلم معاشرے کا ایک حصہ تھے نہ کہ ایک کافر حکومت کی رعایا لیکن بد قسمتی سے ہماری حکومتوں نے نظام تعلیم کی وحدت اور اسلامی تناظر میں اس کی تدوین و تشکیل نو کے لیے کوئی کوشش نہ کی تو علماء کرام نے سوچا کہ ہم جو کام کر رہے تھے وہ تو ختم نہ کریں چنانچہ انہوں نے دینی مدارس قائم کرنے شروع کر دیے۔ بعض دینی مدارس کے منتظمین نے تھوڑا بہت عصری تعلیم کا اہتمام بھی کیا لیکن سارے ملک کے تعلیمی نظام کی وحدت، اصلاح اور اس کی اسلامی تشکیل نو اور اس کے ذریعے افراد کی کردار سازی (یعنی ہر سطح کے نصابات، تربیت اساتذہ، ہم نصابی سرگرمیوں اور تربیت طلبہ کی اسلامی تناظر میں تشکیل و تدوین نو) کے لیے کوئی خاص کوشش نہ کی گئی۔ اب علماء کرام ان دو تین لاکھ طلبہ کی تعلیم و تربیت کا انتظام تو کرتے ہیں جو ان کے پاس مدارس میں پڑھتے ہیں لیکن ان کروڑوں طلبہ کی تعلیم و تربیت کرنے والا کوئی نہیں جو سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھتے ہیں حالانکہ علماء کرام پر تو سارے مسلمانوں کی رہنمائی اور تربیت کا بوجھ ہے اور انہیں اس طرف توجہ ضرور دینی چاہیے۔

جہاں تک مغربی فکر و تہذیب کا تعلق ہے تو دینی مدارس اور تبلیغی جماعت دونوں نہ تو اس سے مرعوب ہیں اور نہ اس سے متاثر و **الحمد للہ علی ذلک** لیکن تبلیغی جماعت اور دینی مدارس دونوں کے کندھوں پر چونکہ عوام کی رہنمائی اور ان کی تعلیم اور اصلاح کا بوجھ ہے اور مغرب کی لادین اور ملحدانہ فکر و تہذیب کی علمبردار قوتیں اور ان کے مسلم حکمران ایجنٹ مسلم معاشرے کو روز بروز دین سے دور لے جا رہے ہیں اور مغربی اصول و اقدار کو مسلم معاشرے میں رائج اور نافذ کر رہے ہیں جس سے ایک دینی اور اخلاقی بحران جنم لے چکا ہے لہٰذا دینی مدارس اور تبلیغی جماعت کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کو گمراہی کے اس سیلاب سے بچائیں۔ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ پہلے وہ خود اپنے حلقوں میں مغربی فکر و تہذیب کے تنقیدی مطالعے کا اہتمام کریں اور اپنے طلبہ اور کارکنوں کی فکری تربیت کریں تاکہ وہ عوام و خواص کو مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب کے طوفان سے بچا سکیں۔

جہاں تک جماعت اسلامی کا تعلق ہے تو اس کا بنیادی نظریہ اقامت دین کا ہے۔ مولانا مودودیؒ اگرچہ اصلاح فرد اور معاشرے کی اہمیت کا انکار نہیں کرتے تھے لیکن ان کی فکر میں شروع ہی سے اس پر بنیادی اصرار رہا ہے کہ ریاست کا اقتدار اسلامی قوتوں کے ہاتھ میں آنا چاہیے تاکہ وہ اس قوت کو اسلام کی بالادستی کے لیے استعمال کر سکیں۔

مولانا مودودیؒ نے نہ صرف اسلام کو عصری اسلوب میں دلائل کے ساتھ پیش کیا بلکہ مغربی فکروتہذیب پر بھی شدید تنقید کی اور اسے جاہلیت خالصہ قرار دیا۔ مغربی فکر وتہذیب کے خلاف ان کا مجموعہ مضامین 'تنقیحات' کے نام سے چھپا اور اہل علم نے ان کے موقف کو سراہا۔ قیام پاکستان سے پہلے ان کی رائے یہ تھی کہ اصلاح فرد اور معاشرہ کے نتیجہ میں ہی وہ ماحول بن سکتا ہے جو ایک فطری انداز میں اسلامی ریاست کو جنم دے سکے (جیسا کہ علی گڑھ میں ان کی اس تقریر سے ظاہر ہے جو'اسلامی ریاست کیسے قائم ہوسکتی ہے؟' کے عنوان سے بار بار چھپتی رہی ہے! تاہم جب مسلم لیگ کی جدوجہد سے پاکستان وجود میں آ گیا تو اسلام کے حق میں عوام کے جوش وجذبہ اور لیگی قیادت کے وعدوں کی روشنی میں انہوں نے محسوس کیا کہ اگر براہ راست سیاسی جدوجہد کی جائے تو ممکن ہے عوام کی حمایت سے وہ اسلامی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہوجائیں چنانچہ انہوں نے اصلاح فرد اور اصلاح معاشرہ کے ذریعے اسلامی ریاست کے قیام کے منہاج کو چھوڑ کر سیاسی جدوجہد کے ذریعے اسلامی ریاست کے قیام کے نظریے پر عمل درآمد شروع کردیا۔ انہوں نے ترجمان القرآن میں ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ہم تجرباً اس منہاج پر کام کرنے چلے ہیں اور اگر ہمیں اس میں خدانخواستہ کامیابی نہ ملی تو ہم 'اصلاح فرد اور اصلاح معاشرہ کے ذریعے قیام ریاست اسلامی منہاج کی طرف لوٹ جائیں گے (یہ بحث اب مولانا کی کتاب 'اسلامی ریاست' کے آخر میں مطبوعہ موجود ہے)۔ منہاج کی اس تبدیلی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب زور دعوت و اصلاح اور تعلیم وتربیت پر نہ رہا بلکہ اصل ہدف سیاسی جدوجہد ہوگئی، چنانچہ تعلیم کی اسلامی تناظر میں اصلاح اور اس کے ذریعے اصلاح فرد ومعاشرہ کی پالیسی عملی ترجیحات میں پیچھے چلی گئی۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں ناکامی کے بعد انہوں نے اپنے اصل منہج کی طرف واپسی کا ارادہ کیا لیکن خود ان کی تیار کردہ جماعتی قیادت اس پر آمادہ نہ ہوسکی کیونکہ خود مولانا نے ان لوگوں کی تربیت 'اسلامی انقلاب بذریعہ سیاسی جدوجہد' کے تصور کے مطابق کی تھی۔ وہ خود تو مفکر تھے ایک نقشہ مٹا کر دوسرا بنا سکتے تھے لیکن جمعیت طلبہ سے چھن کر جماعت کی قیادت تک پہنچنے والے لوگوں کا فکری کینوس اتنا وسیع نہ تھا کہ وہ ۹۰ درجے کی اس تبدیلی کو افورڈ کر سکتے چنانچہ جماعت اسلامی 'انقلاب بذریعہ سیاسی جدوجہد' کے منہاج پر قائم رہی جس میں تعلیم اور دعوت واصلاح بنیادی ترجیح قرار ہی نہیں پاتے۔ اس کے بعد سے جماعت اسلامی مسلسل انتخابی میدان میں ہارتی رہی لیکن وہ اپنے منہج پر نظر ثانی کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اللہ کرے جماعت کو ایسی بیدار مغز قیادت مل جائے جو اس کے منہاج پر نظر ثانی کر سکے۔

جہاں تک جماعتی حلقوں میں مغربی فکروتہذیب کی شناعت کم ہوجانے کا تعلق ہے تو بظاہر اس کے تین بڑے سبب نظر آتے ہیں: **ایک** یہ کہ جب جماعت نے سیاسی جدوجہد کو اقامت دین کا بنیادی منہج

قرار دے دیا اور انتخابی سیاست میں حصہ لینا ناگزیر قرار پایا تو گیم جن قوتوں کے ہاتھ میں تھی ان کی شرائط کو بھی بڑی حد تک تسلیم کرنا پڑا چنانچہ مغرب کی لادین جمہوریت میں چند معمولی کاغذی تبدیلیوں سے اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دے دیا گیا۔ یہ مغربی فکر وتہذیب سے مفاہمت اور اس کے ساتھ تلفیق کا نقطۂ آغاز بنا اور جماعت آئندہ برسوں میں نہ صرف مغرب کے سیاسی نظام سے ایڈجسٹ کرتی اور اس سے مفاہمت کراتی چلی گئی بلکہ اس کے اثرات دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں بھی پھیلتے چلے گئے اور جماعت کو انہیں قبول کرنا پڑا۔

قیامِ پاکستان کے بعد اگرچہ مولانا مودودیؒ سیاسی جدوجہد کی وجہ سے پہلے جتنا علمی کام نہیں کر سکے لیکن جو کام انہوں نے کیا اس میں بھی مغربی فکر وتہذیب کے خلاف وہ طنطنہ مولانا کی تحریروں میں باقی نہ رہا جو 'تنقیحات' کے مضامین میں نظر آتا ہے۔

دوسرے: تاریخ کا جبر یہ ہوا کہ جب مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب کے ردّ کا وقت تھا اس وقت سوشلزم کا غلغلہ اُٹھا اور بھٹو نے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے اسے اٹھا کر پاکستان کے گلی کوچوں میں پھیلا دیا اور کمیونزم وسوشلزم کے حامی نظریاتی کارکنوں، صحافیوں، ادیبوں اور دانشوروں نے اسے طوفان بنا دیا۔ اب اسے حسن اتفاق کہیے یا سوئے اتفاق کہ پاکستان میں نظریاتی سطح پر اس کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ تھا سوائے مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کے۔ چنانچہ مولانا نے بائیں بازو کے خلاف یہ نظریاتی جنگ لڑی اور خوب لڑی اور یہ کہنا شائد غلط نہ ہو کہ جیتی اور سوشلزم کا رخ موڑ دینے میں کامیاب ہو گئے۔ اس جنگ میں مولانا کی تنقید کا رخ مغربی تہذیب سے شفٹ ہو کر سوشلزم کی طرف ہو گیا۔ مخالفین نے اسے مغرب زدگی اور مغرب کی ایجنٹی قرار دیا جو اگرچہ درست نہ تھا لیکن اس شفٹ کا نفسیاتی اور نظریاتی نقصان بہرحال جماعت اور اس کی فکر کو بھی ہوا، ورنہ ظاہر ہے جس اصول سے سوشلزم کے ساتھ اسلامی کا سابقہ غلط ہے، اسی اصول کے تحت جمہوریت کے ساتھ اسلامی کا سابقہ بھی غلط ہے لیکن مولانا اور جماعت نے پہلے کو غلط اور دوسرے کو جائز قرار دے دیا۔

تیسرے: مغربی جمہوریت کو برائے نام کاغذی تبدیلیوں سے اسلامی جمہوریت قرار دینے کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ دینی قوتوں کو کامیاب نہ ہونے دیا گیا، سیاست سیکولر ہو گئی اور لادین اور سیکولر جمہوریت نے زندگی کے دوسرے شعبوں کو بھی سیکولر بنا دیا۔ چونکہ مغربی فکر وتہذیب کی علم بردار مغربی قوتیں اپنی فکر وتہذیب کی یونیورسلائزیشن خصوصاً مسلم ممالک میں اسے رائج ونافذ کرنے پر تلی ہوئی تھیں اور مغرب کے ایجنٹ مسلم حکمرانوں نے اس معاملے میں ان کی معاونت کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستانی معاشرہ آج دین سے بڑی حد تک دور ہو گیا ہے اور مغربی اصول واقدار معاشرے میں غالب آ گئی

ہیں۔ جماعت اسلامی کے کارکن جو قیام پاکستان کے وقت اپنے دعوتی جذبے، اخلاص، اخلاق اور دینی کمٹمنٹ کی وجہ سے معاشرے میں ممتاز مقام رکھتے تھے اس سیاسی جدوجہد کی مستقل اور شدید مصروفیت میں اپنا علمی اور اخلاقی معیار برقرار نہ رکھ سکے جو اسلامی اصول واقدار سے معریٰ تھی نیز مسلسل سیاسی ناکامیوں نے انہیں مایوسی کی راہ بھی دکھائی۔

ان حالات میں جماعتی لوگوں کی نئی نسل کو تعلیم کی پرائیویٹائزیشن کے بعد جو کھلا میدان ملا تو مغربی فکر وتہذیب کی بالادستی کے اس ماحول میں دیگر ابنائے وطن کی طرح وہ بھی اسے ایک کاروبار اور دنیاوی سرگرمی سمجھ کر اس میں مصروف ہوگئے اور پیغمبروں کے اصول دعوت '**یعلمهم الکتاب والحکمة ویزکیهم**' پر عمل پیرا ہونے کی بجائے ان کے ساتھ بھی 'ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد' والا معاملہ ہوگیا حالانکہ یہ مرحلہ مغربی فکر وتہذیب کے خلاف اسی طرح کی نظریاتی کشمکش اور جدوجہد کا تھا جس طرح کی جدوجہد سید مودودیؒ اور جماعت اسلامی نے سوشلزم کے خلاف کی تھی۔ ممکن ہے کچھ بھلے لوگوں نے ذاتی سطح پر مقاومت ومزاحمت کی کوشش کی بھی ہو یا کچھ تھوڑے بہت اقدامات اسلامی تناظر میں کرنے کا جتن کیا بھی ہو لیکن مغرب زدگی کے جس طوفان نے معاشرے پر غلبہ پا رکھا ہے اس میں مغربی فکر وتہذیب کے خلاف بھرپور اور مضبوط جماعتی موقف کے بغیر کسی ایک آدھ فرد کا مزاحمت کے لیے کھڑا ہوجانا آسان اور موثر نہ تھا اور وہ مضبوط موقف اختیار کرنے والی قیادت جماعت میں اب موجود نہ تھی...... جس کے اسباب کا ہم نے سطور بالا میں تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہماری رائے میں اب جماعت کو نشأۃ ثانیہ کی ضرورت ہے جس کے لیے اسے ایک ایسی بالغ نظر قیادت درکار ہے جو ایک طرف اسلامی علوم میں رسوخ رکھتی ہو تو دوسری طرف مغربی فکر وتہذیب کا تنقیدی مطالعہ کر کے، ایک اجتہادی بصیرت کے ساتھ، مستقبل کے خطوط کار اس طرح وضع کرے کہ مغربی فکر و تہذیب کو نہ صرف رد کرے بلکہ اسے روندتے ہوئے اسلامی عزائم اور آدرشوں کا راستہ ہموار کر سکے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جماعت اسلامی کو ایسی قیادت عطا فرمائے کیونکہ جس سیاسی قیادت نے اسلام کے نام پر پاکستان بنایا تھا وہ اسے سچ مچ کا پاکستان بنا نہیں سکی۔ اگر تبلیغی جماعت، دینی مدارس اور جماعت اسلامی جیسی جدید دینی تحریک پاکستانی معاشرے میں صحیح اسلامی تعلیم وتربیت اور دعوت واصلاح کے ذریعے اور مغربی فکر وتہذیب کو رد کرتے ہوئے فرد کی اسلامی ذہن سازی اور تشکیل کردار کے لیے جدوجہد نہیں کرتیں اور اس میں کامیاب نہیں ہوتیں تو یہ جنوب مشرقی ایشیا بلکہ پورے عالم اسلام کی سطح پر ایک ایسا المیہ ہوگا جس پر ہمالیہ تو روئے گا ہی، ہم آنے والی نسلوں کی تباہی کے ذمہ دار بھی ہوں گے اور ان کی نفرین کے مستحق بھی۔

تعلیم و تربیت

محسن فارانی ☆

انگلش میڈیم کی سفاکی

محترم و مکرم ڈاکٹر محمد امین صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے فکر انگیز مضمون ''اسلامی سکول کیوں ناکام ہیں؟'' کے جواب میں محمد وقاص صاحب اور پروفیسر ملک محمد حسین صاحب کے مضامین نظر سے گزرے۔ افسوس کہ دونوں صاحبان انگلش میڈیم کی زہرناکی کے احساس سے عاری ہیں۔ پروفیسر صاحب نے تو اپنے طویل مضمون میں انگلش میڈیم کا ذکر کرنے ہی کی زحمت گوارا نہیں کی جب کہ وقاص صاحب نے یہ لکھ کر جہالت کا ثبوت دیا کہ ''انگریزی تہذیب اور اس کے افکار و نظریات کی مخالفت بجا لیکن اس بہانے انگریزی زبان کا دروازہ اپنے اوپر بند کر لینا یا اس کے مقابلے میں اردو زبان کو مذہبی تقدس دینا محض ایک واہمہ ہے...... اگر تعلیم مادری زبان میں دینا ضروری ہے تو پھر تو اس کے لیے پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتو زیادہ موزوں زبانیں ہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ انگریزی علوم و فنون کی زبان ہے اور فی زمانہ انگریزی بطور زبان سیکھنے کا کوئی بھی منکر نہیں اور نہ مسئلہ اُردو زبان کے تقدس کا ہے۔ مسئلہ تو قوم کے بچوں کی تعلیم کا ہے کہ انہیں علوم اپنی زبان میں یا غیر زبان میں سکھائے جائیں؟ دنیا بھر کے ماہرین کا اتفاق ہے کہ بچوں کو تعلیم اس زبان میں دی جائے جو ان کے ماحول میں عام بولی اور سمجھی جاتی ہو اور اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ مادری زبان ہی ہو۔ لیکن ہمارے ہاں کے انگریزی کے عاشق اس موٹی سی بات کو سُننے اور سمجھنے کو تیار نہیں۔ جب قومی زبان اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی بات کی جائے تو وہ خلط مبحث اور کٹ حجتی پر اُتر آتے ہیں اور پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتو میں تعلیم دینے کا راگ سنانے لگتے ہیں۔ مسلمانوں نے جب عروج حاصل کیا تھا تو اُنہوں نے اس دور کی علمی زبان یونانی کو ذریعۂ تعلیم نہیں بنا لیا تھا بلکہ بیت الحکمت (بغداد) میں یونانی اور دیگر زبانوں کی کتابوں کے ترجمے کر کے عربی کو علمی زبان بنا لیا تھا اور پھر صدیوں تک دنیا کے بیشتر حصے میں عربی ہی ذریعۂ تعلیم بنی رہی۔ آج بھی ترقی یافتہ ممالک جاپان، رُوس، فن لینڈ، ترکی، ملائشیا، جرمنی، فرانس، سپین، چین، ناروے، سویڈن، ڈنمارک، آسٹریا، نیدرلینڈ، حتیٰ کہ ایران اور تمام عرب ممالک میں

☆ مورخ و محقق، دارالسلام، لاہور

اپنی اپنی قومی زبان ہی ذریعۂ تعلیم ہے اور ان کی نئی نسلوں کو کسی غیرملکی زبان میں علم حاصل کرنے کا کشٹ نہیں اُٹھانا پڑتا۔لیکن ہمارے ہاں کے' کالے انگریز' اور عاشقانِ انگریزی مُصر ہیں کہ قوم کے بچوں کو انگریزی ہی میں تعلیم دی جائے گی خواہ ۷۰ فیصد طلبہ انگریزی میں فیل ہو کر مزید تعلیم حاصل کرنے ہی سے توبہ کرلیں۔ انگلش میڈیم کے حامی ان ظالموں کو ذرا ترس نہیں آتا کہ ہر سال قوم کے لاکھوں بچوں کا مستقبل انگریزی کے جبر کے باعث برباد ہو رہا ہے اور انگلش میڈیم کے باعث ہی قومی زبان اردو کے نفاذ کا راستہ روکا جا رہا ہے۔

یہاں ہم چین کی بات کریں گے جس نے نصف صدی میں تحیر خیز مادی ترقی کر کے ایک دنیا کو آگے لگا رکھا ہے۔ چینیوں نے نئی نسلوں کو کسی غیر زبان میں نہیں بلکہ اپنی چینی زبان 'مینڈارن' میں تعلیم دے کر یہ ترقی کی ہے۔ انہوں نے انگریزی اور دیگر زبانوں سے علوم اپنی زبان میں منتقل کر کے اپنے بچوں کو تعلیم دی ہے اور ان کی کھوپڑیوں پر کسی غیر زبان کا ٹوپ چڑھانے کی حماقت نہیں کی۔لیکن ہم ہیں کہ بچوں کے ذہنوں کو انگریزی کے شکنجے میں کس کر ان کی بھاری تعداد کو علوم سے بے بہرہ رکھنے پر مُصر ہیں۔ چین میں انگریزی ایک علمی زبان کے طور پر پڑھائی جاتی ہے جس قدر اس کی ضرورت ہے اور جن کو ضرورت ہے۔ چینی حکمران دنیا میں ہر کہیں اپنی زبان میں بات کرتے ہیں اور ابلاغ کے لیے ترجمان ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ بچوں کو اپنی زبان میں تعلیم دینا وقاص صاحب کے الفاظ میں 'انگریزی زبان کا دروازہ اپنے اوپر بند کرلینا' ہے مگر حقیقتاً ایسا ہرگز نہیں۔ یہی فطری طریقہ اور ترقی کا راستہ ہے کہ بچے اپنی زبان میں تعلیم حاصل کریں۔ انگریزی کو بطور ایک زبان کے چھٹی سے میٹرک یا ایف اے تک پڑھایا جا سکتا ہے جیسا کہ انگریزی دور سے پڑھائی جاتی رہی ہے لیکن پورے نظام تعلیم کو انگریزی کے شکنجے میں کس دینا ظلم عظیم ہے۔

رہی بات علاقائی زبانوں کی تو دنیا میں ہر کہیں، ہر ترقی یافتہ ملک میں، ایک بڑی قومی زبان ہی کو ملکی ذریعہ تعلیم کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے۔ برطانیہ میں آئرش، سکاٹش اور ویلش زبانیں بھی ہیں مگر ذریعۂ تعلیم کے طور پر انگلستان (Englnd) کی زبان انگلش پورے ملک میں رائج ہے۔ چین میں بیسیوں زبانیں ہیں لیکن وہاں بھی ذریعۂ تعلیم مینڈارن چینی ملک کی ایک بڑی زبان ہے جو مشرقی چین میں بیجنگ اور اس کے آس پاس بولی جاتی ہے۔لیکن ہمارے عاشقانِ انگریزی اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے سوال پر فوراً علاقائی زبانوں پنجابی، سندھی وغیرہ کا راگ الاپنے لگتے ہیں اور اس حقیقت کو جانتے

ہوئے بھی نہیں مانتے کہ اردو پورے ملک میں گلگت سے لے کر کراچی اور گوادر تک بولی اور سمجھی جاتی ہے اور یہی زبان ہے جو علمی ذخیرے سے مالا مال ہے۔ پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتو زبان کے طور پر سکولوں میں پڑھائی جاسکتی ہیں لیکن ذریعۂ تعلیم ایک قومی زبان اردو ہوگی تو قوم فکری انتشار واضمحلال سے نکل کر ترقی بھی کرے گی اور اس میں وحدت بھی پیدا ہوگی۔ یہ بات بابائے قوم بخوبی سمجھتے تھے تبھی انہوں نے اردو کے قومی زبان ہونے کا فیصلہ کر دیا تھا اور دنیا میں ہر کہیں قومی زبان ہی ذریعہ تعلیم اور دفتری زبان ہوتی ہے۔ کاش! عاشقانِ انگریزی سمجھ سے کام لیں۔

۲۔ اسداللہ غالب کے مہمان کالم میں اویغور ترک مسلم قوم کا نام یغور لکھا گیا ہے جو درست نہیں۔ اویغفور جن ترک علاقوں پر ایک آزاد مملکت قائم کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں، ان میں غالب صاحب نے پاکستان کو بلاوجہ شامل کر دیا ہے۔ اگر ایغوروں نے کوئی ایسا نقشہ شائع کیا ہے تو الگ بات ہے۔ افغانستان کے شمال میں ازبک اور تاجک آباد ہیں جو ترکی النسل ہیں لہٰذا شمالی افغانستان کے بعض علاقے تو عظیم ترک مملکت میں شامل ہوسکتے ہیں، پاکستان کا کوئی علاقہ اس دائرے میں نہیں آتا، البتہ ازبکستان، ترکمانستان اور تاجکستان ترکی النسل ہیں جن کا کالم نگار نے ذکر ہی نہیں کیا۔

۳۔ ابواوّاب صاحب کے کالم میں نائیجریا میں ۵۵ لاکھ مسلمان، ۴۰ لاکھ عیسائی اور ۵ لاکھ مقامی مذاہب کے پیروکار' بتائے گئے ہیں۔ حالانکہ یہ ان کا فیصد تناسب ہے یعنی ۱۶ کروڑ کی ملکی آبادی میں مسلمان ۵۵ فیصد، عیسائی ۴۰ فیصد اور مقامی مذاہب کے پیروکار ۵ فیصد ہیں۔

والسلام،

نیازمند،

(محسن فارانی)

لاہور

سازش تھیوری (Conspiracy Theory)

ہمارے دشمن کی عیاری اور ہماری سادہ لوحی دیکھیے کہ اس نے پروپیگنڈے سے ہمارے ہاں سازش تھیوری کو ایک اضحوکہ بنا دیا ہے یہاں تک کہ اب مسلم اہل علم میں سے کوئی اس کا ذکر

کرنے کی جرأت نہیں کرتا...... جب کہ مغرب ہمارے خلاف دھڑلے سے سازشیں کیے جارہا ہے۔

تعلیم و تربیت

عزیز احمد مرزا

ابتدائی بچپن کی تعلیم
(Early Childhood Education)

کنبہ ہو یا معاشرہ اگر ان کے معتقدات اور ان معتقدات کی بنیاد پر تشکیل پانے والا نظام اقدار جاندار ہو پھر معاشرہ کو اپنے معتقدات اور اقدار حیات سے دلی و عملی وابستگی بھی ہو تو معاشرتی استقلال کا تقاضا ہوتا ہے کہ یہ معتقدات اور اقدار نئی نسلوں کو موثر طور پر منتقل ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے اسلام کو ہمارے دین کے طور پر پسند فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآنِ مجید اور آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعلیمات پر مبنی معتقدات اور اقدار سے بہتر معتقدات اور اقدار ہو نہیں سکتیں۔ ہماری دینی غیرت اور دنیا و آخرت کی فلاح کا تقاضا ہے کہ ہمارے معتقدات، اقدار اور طرزِ معاشرت آئندہ نسلوں کو بطریق احسن منتقل ہوں۔

آئندہ نسلوں کے افراد کی دوسری اہم ضرورت یہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی سے بھرپور تمتع کے لیے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیتوں کی بھرپور نمو ہو۔ بچوں کے حواس کی تربیت ہو، ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا ادراک ہو، ان میں تحریک پیدا ہو تا کہ وہ کشف و ایجاد کو بروئے کار لائیں اور تسخیر کائنات میں کارہائے نمایاں سرانجام دینے کے قابل ہو جائیں۔

انسانی بچہ، خواہ مسلم گھرانے میں آنکھیں کھولے خواہ غیر مسلم گھرانے میں، مندرجہ ذیل صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے:

آلاتِ حصولِ علم اور آموزش

سورۃ النحل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اللّٰہُ اَخۡرَجَکُمۡ مِّنۡۢ بُطُوۡنِ اُمَّہٰتِکُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ شَیۡئًا ۙ وَّ جَعَلَ لَکُمُ السَّمۡعَ وَ الۡاَبۡصَارَ وَ الۡاَفۡـِٕدَۃَ ۙ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ۔ (سورۃ النحل: ۷۸)

۱۔ آیت مذکورہ میں لفظ الافئدۃ استعمال ہوا ہے، جوفواد کی جمع ہے جس کے معنی دل کے ہیں لیکن یہ لفظ اس عضو کے لیے استعمال نہیں ہوتا جو سینے کے اندر دھڑکتا ہے بلکہ اس مقام کے لیے استعمال ہوتا ہے جو انسان کے شعور و ادراک اور جذبات وخواہشات، عقائد وافکار اور نیتوں اور ارادوں کا مقام ہے (تفہیم القرآن)

''اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا، اس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے۔ اس نے تمہیں کان دیے، آنکھیں دیں اور سوچنے والے دل دیے، اس لیے کہ تم شکرگزار بنو۔''

گھر آموزش کا پہلا ادارہ

گھر بچے کا پہلا اور بنیادی مدرسہ ہے۔ بچے کی پیدائش کے پہلے روز ہی اس کی تعلیم شروع ہوجاتی ہے۔ اس کی تعلیم ماں کی گود، اپنے جھولے اور گھر کے آنگن میں مسلسل جاری رہتی ہے۔ اسی ماحول میں وہ بیٹھنا، فرش پر گھسٹنا، پھر کھڑے ہونا اور چلنا پھرنا سیکھتا ہے۔

☆ یہیں وہ بولنا سیکھتا ہے۔ اسی ماحول میں وہ نطق (Speech) جیسی کارآمد مہارت پر عبور حاصل کرتا ہے۔

☆ نطق کی اس مہارت سے وہ مادری زبان (Mother Tongue) سیکھتا ہے۔ زبان کی مثال بجلی کے تار کی سی ہے۔ جیسے دھاتی تار سے کرنٹ روشنی کے قمقموں اور گھر میں استعمال کی مشینوں تک پہنچتا ہے۔ قمقمے روشن ہوکر ماحول کو منور کرتے ہیں اور مشینیں آپ کے لیے بہت سی خدمات بجالاتی ہیں، ایسے ہی علم گھر کے ماحول اور گھر میں موجود شخصیات سے زبان کے واسطے سے بچے کو منتقل ہوتا ہے۔

☆ بچہ اس مادری زبان میں اپنی حاجات اور اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ گھر والوں سے مکالمہ کرتا ہے۔ اپنی کہتا اور اُن کی سنتا ہے۔

اسی زبان کے واسطے وہ بہت سی اشیاء، افراد، رشتوں اور افعال کے نام سیکھتا ہے اور نت نئ معلومات حاصل کرتا ہے۔

بچہ حاصل ہونے والی معلومات کا محض سٹور ہاؤس بن کے نہیں رہ جاتا بلکہ وہ سوچتا ہے۔ اس کے ذہن میں سوالات جنم لیتے ہیں وہ ان کا جواب چاہتا ہے۔ اپنے تجسس کی تسکین کے لیے سوال پوچھتا ہے۔ ماحول سے حاصل ہونے والی معلومات اس کی ذہنی اور تخلیقی صلاحیتوں کو مہمیز کرتی ہیں۔ وہ جن مہارتوں پر عبور حاصل کرتا ہے ان کی کارکردگی دکھاتا ہے۔ اپنی فتوحات پر مسرت کا اظہار کرتا ہے اور افرادِ خانہ میں خوشیاں بانٹتا ہے۔ یوں اس کی شخصیت کی تعمیر ہر آن ہوتی رہتی ہے اور اس تعمیر میں بڑا موثر

کردار اس کی مادری زبان کا ہوتا ہے۔

گھر میں بچہ ماں کی الفت ومحبت، باپ کی شفقت، دادا دادی، نانا نانی اور بہن بھائیوں کے پیار کی حلاوت اور رشتوں کی چاشنی سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ ہر بچہ گھر کے تمام افراد کی توجہ اور محبت کا مرکز ہوتا ہے، ان سب کے مشفقانہ سلوک سے اسے اپنی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔

گھر کے ماحول میں بچہ دن طلوع ہوتے دیکھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ گھر کے افراد کچھ خاص سرگرمیوں میں لگ گئے ہیں۔ خود اسے ٹائلٹ لے جایا جاتا ہے یا اسے وہاں جانے میں مدد دی جاتی ہے۔ اس کا منہ دھلایا جاتا ہے یا نہلایا جاتا ہے۔ لباس تبدیل کیا جاتا ہے۔ ناشتہ کرایا جاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ دھوپ اور روشنی پھیلتی چلی جاتی ہے۔ دوپہر ہوتی ہے۔ دن ڈھلتا ہے۔ شام ہوتی ہے۔ مختلف اوقات کے ساتھ مختلف سرگرمیاں وابستہ ہوتی ہیں۔ پھر رات آتی ہے اور سب سو جاتے ہیں۔

وہ موسموں کو بدلتے دیکھتا ہے۔ رت بدلنے کے ساتھ لباس میں تبدیلی آتی ہے۔ گرمیوں میں اسے سوتی اور سردیوں میں گرم کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ کبھی وہ ہوا میں تیزی آتے اور کبھی بارش برستے دیکھتا ہے۔ ان سب تجربات سے گزرتے ہوئے اس کے زمان ومکان کے تصورات تشکیل پاتے ہیں اور ان میں نکھار آتا ہے۔

پھر گھر ہی وہ جگہ ہے جہاں بچہ اُٹھنے بیٹھنے، کھیلنے، کھانے پینے کے آداب سیکھتا ہے۔ بڑوں کو سلام کرنا، دائیں ہاتھ سے کھانا، کھانے سے پہلے بلکہ ہر کام کرنے سے پہلے بسم اللہ کہنا سیکھا تا ہے۔ گھر میں خوشی اور غمی کے ماحول میں مختلف رویوں کو دیکھتا ہے۔ اپنے تہوار اور معاشرت کے طرز دیکھتا ہے اور ان میں حسب مرتبہ حصہ لیتا ہے۔

بچے کی زندگی میں گھر اور افراد خانہ کے اسی موثر کردار کی بنا پر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ گھر اس کا بنیادی اور پہلا مدرسہ ہے اور کسی نے کیا خوب کہا ہے: School at mother`s knees۔ اس گفتگو سے یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ کوئی معمولی مدرسہ نہیں بلکہ نہایت موثر مدرسہ ہے۔ گھر کا ہر فرد معلم ہے اور بے دام اور نہایت مخلص معلم ہے اور فطری طریقے سے بچے کی نمو تعلیم اور کردار سازی میں موثر کردار ادا کرتا ہے۔ یہ مدرسہ ہمہ وقتی اور غیر رسمی ہے۔

رسمی تعلیم

نوعِ انسانی کے باوا آدم کی تخلیق کے بعد انہیں خود خالق نے تعلیم دی۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآئَ

كُلَّهَا۔

دنیا کی زندگی میں آدم اور ان کی اولاد کو قدم قدم پر علم کی ضرورت تھی۔ کائنات کیسے وجود میں آئی؟ کائنات اور خود انسان کا خالق کون ہے؟ کائنات میں انسان کا مقام کیا ہے؟ انسانوں کی معاشرت کیسی ہو؟ معیشت میں حلال وحرام کی حدود کیا ہیں؟ انسانی زندگی اور خود کائنات کا مآل کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ان سب باتوں کا علم (ہدایت) انبیاء کے ایک طویل سلسلہ پر وحی کے ذریعہ نازل فرمایا اور انبیاء کرام کے ذریعہ عالمگیر انسانیت کو پہنچایا حتیٰ کہ ہدایت کا سلسلہ نبی آخر زماں حضرت محمد ﷺ پر تکمیل کو پہنچا۔

وحی کے علاوہ زندگی کو منضبط کرنے، اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں اور بحر و بر کے خزانوں سے متمتع ہونے (تسخیر کائنات) کے لیے ضرورت تھی کہ انسان اپنی کاوش سے علم حاصل کرے۔ اشیاء کے خواص جانے، توانائی کی مختلف صورتوں سے آگاہ ہو، مادی اشیاء اور کائنات میں کارفرما قوتوں کو اپنے مفاد میں استعمال کر سکے۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ ہر انسان کو آلاتِ حصول علم دے کر دنیا میں بھیجتا ہے۔

آلاتِ تحصیل علم

قرآن مجید میں یہ جو فرمایا گیا:

''اللہ تعالیٰ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ نہیں
جانتے تھے اور اس نے تمہارے لیے سمع، بصر اور دل بنائے تا کہ تم شکر گزار بنو۔''

اس سے اس حقیقت کا بیان مقصود ہے کہ انسان کو دیگر تمام مخلوقات پر جو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ مکمل لاعلمی کی حالات سے نکل کر صاحبِ علم بن جاتا ہے۔ یہ کانوں کی سماعت، آنکھوں کی بصارت اور ذہن کے وظائف کی بنا پر ممکن ہوا لہٰذا انسان پر واجب ہے کہ اس عطائے خاص پر وہ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار رہے۔

یوں تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو پانچ حواس عطا فرمائے ہیں، جن کے ذریعے انسان کو علم حاصل ہوتا ہے لیکن مندرجہ بالا آیت میں صرف دو حواسوں کا ذکر فرمایا کیونکہ انسان کو حاصل ہونے والے علم کی بیشتر مقدار سماعت اور بصارت کے راستے حاصل ہوتی ہے۔ جب کہ دیگر تین حواس کی کارکردگی محدود ہے۔

انسان کو حواس کے ذریعے جو معلومات (Information) حاصل ہوتی ہیں، وہ ذہن کو منتقل

ہوتی ہیں۔ ذہن ان معلومات کی تفہیم کرتا ہے، انہیں معانی ومطالب عطا کرتا ہے اوران کی تحفیظ کرتا ہے۔ یہ آموزش کی ابتدائی اورسادہ صورت ہے۔

آموزش کی ایک مثال

والدہ چھ ماہ کے بچے کو گود میں لیے ایک صاحب کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اشارہ کرتے وقت وہ لفظ 'ابو' بولتی ہے۔ بچہ آنکھوں سے والد کا چہرہ دیکھتا ہے۔ کانوں سے لفظ ابو سنتا ہے۔ ذہن لفظ ابو کو والد کی شکل وصورت سے وابستہ (Associate) کرتا ہے۔ چند روز تک والدہ کی اس بار بار کی مشق کے نتیجہ میں والد کی صورت اور لفظ ابو کی باہمی وابستگی (Association) بچے کے ذہن میں محفوظ ہوجاتی ہے۔ گویا ایک فائل کھل گئی، پھر زندگی بھر وہ والد کے متعلق حاصل ہونے والی ان ابتدائی معلومات کو اپنے مفاد میں استعمال کرتا ہے اوران میں مزید معلومات کا اضافہ بھی کرتا چلا جاتا ہے۔ والد کی شفقت، قوامیت، گھر میں ان کے قائدانہ اورسرپرستانہ کردار، ان کے علم واخلاق کے ذاتی تجربہ اورمشاہدہ سے وہ اپنے ذہن میں ابتداً ابھرنے والے ہیولا میں رنگ بھرتا چلا جاتا ہے۔ والد اولاد کی جسمانی ضروریات (خوراک، لباس اوررہائش) تو پوری کرتا ہی ہے لیکن اس کے علاوہ وہ کردار کا ماڈل بھی ہوتا ہے۔

اشیاء کے متعلق آموزش

یہی حال اشیاء کے متعلق آموزش کا ہے۔ ماں شیشے کے گلاس میں پانی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ زبان سے لفظ پانی بولتی ہے اور گلاس بچے کے ہونٹوں سے لگا دیتی ہے۔ بچہ آنکھوں سے پانی کو دیکھتا ہے۔ زبان سے چکھتا ہے (اگرچہ اس کا کوئی ذائقہ نہیں) اورکانوں سے لفظ 'پانی' سنتا ہے۔ بار بار کی اس مشق کے نتیجے میں اس کا ذہن پانی کے ذائقہ اوراس کی بے رنگی کو لفظ پانی سے وابستہ کر کے محفوظ کر لیتا ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ پانی کے خواص اوراستعمالات کے متعلق مزید معلومات کو بچہ اپنے ذہن میں محفوظ کرتا چلا جاتا ہے۔

اوپر بیان کی گئی مثالوں میں آنکھیں افراد اوراشیاء کو دیکھتی ہیں، کان ان کے نام سنتے ہیں اور ذہن ان اشخاص واشیاء کے ناموں اور بچے کے مشاہدہ، تجربہ یا مطالعہ کے نتیجہ میں معلوم ہونے والے اوصاف وخواص کو محفوظ کرتا ہے۔

آموزش کے عمل میں عموماً ایک سے زیادہ حواس مل کر کام کرتے ہیں۔ ان مثالوں میں دو حسوں اور ذہن کی مشترکہ کارگزاری کا ذکر کیا گیا ہے۔

سماعت + بصارت + ذہن

سمع بصر فواد

ذہن کا یہی عمل ہے جسے محولہ بالا آیت میں الافئدۃ کہا گیا ہے۔ اس پر ہم مزید گفتگو آگے چل کر کریں گے۔ فی الحال ہم انسان کے لیے خالق کی اس سے بھی فائق تر عطا کا ذکر کریں گے۔

انسان کی نوک پلک کا درست کیا جانا اور نفخ روحِ خداوندی

سورۃ السجدہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

الَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ٥ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ٥ ثُمَّ سَوّٰهُ وَ نَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ جَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ ٥ (آیات ۷ تا ۹)

''(اللہ وہ ہے) جس نے جو چیز بھی بنائی خوب ہی بنائی۔ اس نے انسان کی خلقت کا آغاز مٹی سے کیا۔ پھر اس کی نسل حقیر پانی کے خلاصہ سے چلائی۔ پھر اس کے نوک پلک سنوارے اور اس میں اپنی روح پھونکی اور تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے۔ تم بہت ہی کم شکر گزار ہوتے ہو۔''

ان آیات میں سے ہم دو نکات کی تشریح مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی تفسیر تدبر قرآن سے نقل کر رہے ہیں:

ثُمَّ سَوّٰهُ وَ نَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (السجدہ: ۹)

تسویۃ کے معنی کسی چیز کو سنوارنے اور اس کی نوک پلک درست کرنے کے ہیں۔ آرٹ کی اصطلاح میں جس چیز کو تکمیلی یا اتمامی عمل (Finishing Touch) کہتے ہیں ٹھیک وہی مفہوم تسویۃ کا ہے۔

نَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ میں روح سے مراد وہ روح ہے جس کو ہم روحِ ملکوتی سے تعبیر کرتے ہیں۔ انسان کے اندر حیوانی روح کے ساتھ ایک نور ِیزدانی (Divine spark) بھی ہے اور اسی نور کے فیض سے انسان کے سمع و بصر اور فواد میں وہ روشنی پیدا ہوئی ہے جس سے اس کو اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہوا ہے۔ اگر اس روشنی سے وہ محروم ہوجائے تو پھر اس کا باطن بھی اسی طرح تیرہ و تار ہے جس طرح حیوانات کا ہے۔ کان، آنکھ اور دل حیوانات کے پاس بھی ہیں۔ لیکن وہ نورِ یزدانی سے محروم ہیں۔ اس وجہ سے ان کے کانوں، آنکھوں اور دلوں میں وہ صلاحیت نہیں ہے جو انسان کے سمع، بصر اور دل میں

ہے۔اگرانسان اپنے کواس نور سے محروم کرلےتو پھروہ بھی ایک حیوان ہے۔یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس نورکو باقی رکھنااوراس کو بڑھانا یا گھٹانا انسان کے اپنے اختیار پر منحصر ہے۔جولوگ اس کی قدر کرتے ہیں اوراس کے حقوق ادا کرتے ہیں وہ اس میں اضافہ کرتے ہیں اوران کے اندر یہ قوی سے قوی تر ہوجاتا ہے اور جولوگ اس کی قدر نہیں کرتے ان کے اندر یہ ضعیف ہوتے ہوتے بالکل ہی بجھ جاتا ہے۔

بہترین ساخت پر تخلیق

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِ نْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (التین: ۴)

''ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر بنایا۔''

''تقویم کا لغوی مفہوم تو کسی چیز کو سیدھا کرنا ہے مثلاً کہیں گے **قومت الرمح فاستقام** (میں نے نیزے کو سیدھا کیا تو سیدھا ہو گیا)۔ پھر اسی مفہوم سے ترقی کر کے یہ لفظ کسی شے کو کسی خاص مقصد کے لیے موزوں اور مناسب بنانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔''

انسان کے متعلق قرآن میں بار بار یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ اس کو خدا نے عبث نہیں بنایا بلکہ ایک عظیم غایت (بالحق) کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ وہ غایت یہ ہے کہ اس دنیا کے دارالامتحان میں وہ شیطان اوراس کے ایجنٹوں کی ترغیبات وترہیبات سے بچتا ہوا زندگی کی اس صراطِ مستقیم پر گامزن رہے جو اس کے رب نے اس کے لیے کھولی ہے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ابدی بادشاہی بخشے گا اور اگر وہ شیطان کی ترہیب سے بہک کر یا اس کی ترغیب سے ڈر کر اس صراطِ مستقیم کو چھوڑ بیٹھے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ہلاکت کی اس وادی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دے گا جو وہ اپنے لیے پسند کرے گا۔ انسان کو اس غایت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے نہایت بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے۔ اس کی ظاہری ساخت بھی گواہ ہے کہ وہ اشرف المخلوقات اوراس کی باطنی صلاحیتیں بھی اتنی اعلیٰ ہیں کہ اس زمین کی تمام مخلوقات میں سے صرف وہی ان کا اہل بن سکا ہے (تدبر قرآن)۔

بوکوحرام

بوکوحرام کا مطلب ہے 'مغرب زدہ تعلیم حرام ہے' جب کہ طالبان سکول جلانے کو اپنا مشن سمجھتے ہیں۔ پاکستان میں اسلامی سکول چلانے والوں کو سوچنا چاہیے کہ ان کے 'جدید اسلام' اوران

اسلامی تنظیموں کے'انتہا پسند اسلام' میں اتنا فرق کیوں ہے؟

تعلیم و تربیت

پروفیسر ملک محمد حسین ☆

پاکستان کے قومی نظامِ تعلیم کی تشکیل میں ناکامی

اندرونی اور بیرونی اسباب

کسی بھی قوم کا نظامِ تعلیم اس کے نظریہ حیات، اس کی تاریخی روایات، مقامی ثقافت اور اس کے مستقبل کے خوابوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل کا احاطہ کرتے ہوئے کسی بھی قوم کا قومی نظامِ تعلیم اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ قومی اقدار اور معاشرے کی روایات نسل در نسل منتقل ہوتی رہیں نیز عصری تقاضوں کے مطابق معاشی، سائنسی اور تکنیکی ترقی کی منازل مسلسل طے ہوتی رہیں۔

پاکستان اقوام عالم کی برادری میں ایک منفرد قوم ہے کہ اس کی تعمیر و تشکیل کسی نسل، برادری، زبان اور جغرافیہ کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایک آفاقی نظریۂ حیات کی بنیاد پر ہوئی جو اسلام کے نام سے موسوم ہے۔ اسلام جو بنی نوع انسان کا ازل سے ابد تک کا دین ہے۔ آدم علیہ السلام سے لے کر نبی آخرالزماں محمد ﷺ تک سب پیغمبروں، رسولوں اور نبیوں نے جس دین کی تبلیغ کی اور جس کی بنیاد **"لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ"** پر ہے۔ اس منفرد قوم کا نظامِ تعلیم بھی منفرد ہوگا جس کی بنیاد کلمۂ توحید پر اور جس کی تعلیم کا لوازمہ قرآنِ حکیم اور جس میں انسانوں کے سیرت و کردار کی تشکیل اسوۂ حسنہ پر استوار ہے۔ اگر پاکستان کے مخصوص ثقافتی، جغرافیائی اور دینی ماحول کو سامنے رکھ کر اس کے قومی نظامِ تعلیم کے عناصر پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں اس کی بنیادیں ۱۹۷۳ء کے متفقہ آئین میں مل جاتی ہیں۔

۱۔ پاکستان کے آئین میں شامل قرار دادِ مقاصد اور آرٹیکل 31 میں ریاست کی یہ ذمہ داری بصراحت بیان کی گئی ہے کہ ریاست پاکستان کے عوام کو تعلیم و تربیت کے ذریعے اس قابل بنائے گی کہ وہ اپنی زندگی اسلام کے مطابق گزار سکیں جیسا کہ قرآن وسنت میں بیان کیا گیا ہے۔

۲۔ آئین کا آرٹیکل 25-A پانچ سال سے سولہ سال کی عمر تک تمام لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے تعلیم کا حصول لازمی قرار دیتا ہے۔

۳۔ آئین کا آرٹیکل 37 تمام شہریوں کے لیے میٹرک تک مفت اور لازمی تعلیم کو یقینی بنانے کا اہتمام کرتا ہے نیز اسی آرٹیکل میں ہائر اور ٹیکنیکل ایجوکیشن سب شہریوں کو بلاتمیز رنگ ونسل و مذہب میرٹ پر اور یکساں طور پر مہیا کرنے کو یقینی بناتا ہے۔

☆ ممتاز ماہر تعلیم، جوہرآباد (خوشاب)

۴۔ آئین اردو کو بطور قومی زبان زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کرنے کا اعلان کرتا ہے۔

۵۔آئین مختلف علاقوں اور مختلف طبقات میں فرق اور امتیاز کو مٹانے کے لیے اقدامات کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔

۶۔ قرآن اور عربی کی تعلیم سب مسلمانوں کے لیے لازمی قرار دیتا ہے۔

اسلامی نظریہ حیات کے آفاقی اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے ،مسلمانوں کی تعلیمی روایات جو اسلام کے آغاز سے مسلمان ملکوں پر مغربی استعماری تسلط قائم ہونے تک تسلسل کے ساتھ جاری رہیں اور مذکورہ آئینی شقوں کی روشنی میں پاکستان کے قوم نظامِ تعلیم کے جو اساسی عناصر سامنے آتے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ نظامِ تعلیم کی بنیاد قرآنِ مجید ہوگا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معلمانہ رول اور پیغمبرانہ فرائض کے چار پہلو بیان کئے گئے ہیں۔ یہ چار پہلو تلاوتِ آیات، تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور تزکیۂ نفس ہیں۔

۲۔تعلیمِ حکمت اور تزکیۂ نفس کے حوالے سے سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنیادی لوازمہ فراہم کرے گی۔

۳۔ تعلیمِ حکمت قرآن وسنت کی روح لیے اُن شعبہ جات کی تعلیم ہوگی جن کے ذریعے سے کاروبارِ جہاں، مفادِ عامہ اور عصری تقاضوں کے مطابق اہتمام خشک وتر یقینی بنایا جائے گا۔

۴۔ جیسا کہ آئین کا آرٹیکل 31 تقاضا کرتا ہے عربی زبان کی تعلیم سب کے لیے لازمی ہوگی تا کہ عوام قران وحدیث سے براہِ راست استفادہ کر سکیں۔

۵۔ اردو قومی اور رابطے کی زبان کی حیثیت سے تعلیمی اداروں کی زبان ہوگی اور ہر سطح کی تعلیم کا میڈیم اردو ہوگا۔

۶۔ ہر سطح کی تعلیم بلا امتیاز سب کے لیے مفت ہوگی اور طلبہ سے کسی سطح پر کسی قسم کی کوئی فیس وصول نہیں کی جائے گی۔

۷۔ اساتذہ کی صلاحیت کے ساتھ صالحیت اور سیرت وکردار کا اسلامی نمونہ لازمی ہوگا۔

۸۔ تفکر، تدبّر اور تعقل پر مبنی تحقیقی رویہ پورے نظامِ تعلیم کا عموماً اور اعلیٰ تعلیم کا خصوصاً ایک لازمی جزو ہوگا۔

۹۔ میٹرک یا 16 سال کی عمر تک کا نصاب اس طرح وضع کیا جائے گا کہ اس سطح تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہر نوجوان لڑکا اور لڑکی اپنی زندگی پوری کامیابی کے ساتھ ایک مکمل مسلمان کی حیثیت سے

گزار سکے۔

۱۰۔ دیگر اقوام سے علمی استفادہ، دوسروں تک اسلام کا آفاقی پیغام پہنچانے اور اقوام عالم کے ساتھ مئوثر رابطوں کی خاطر اہم غیر ملکی زبانوں کی تعلیم بھی اس نظامِ تعلیم کا جزو لاینفک ہوگا۔ اہمیت اور ضرورت کے مطابق غیر ملکی زبانوں کی تعلیم کا اہتمام کیا جائے گا۔

۱۱۔ تعلیم کا انتظام وانصرام اہل تعلیم اور اعلیٰ سطح کے دانشوروں اور علماء کرام کے ہاتھوں میں ہوگا اور تعلیم کا انتظامی ڈھانچہ اس طرح وضع کیا جائے گا کہ وہ معاملات کو نمٹانے کے لیے سہولت اور معاونت مہیا کرے۔

۱۲۔ معیارِ تعلیم، اساتذہ کے کردار اور انتظامی ڈھانچے کو درست خطوط پر رکھنے کے لیے تعلیمی محتسب کا ادارہ قائم کیا جائے گا۔ تعلیمی محتسب اعلیٰ عصری اور اسلامی علوم کا ماہر، اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کا مالک ایک تجربہ کار شخصیت ہوگی جس کا تقرر سپریم کورٹ کے ججز کی طرح سپریم جوڈیشنل کونسل کرے گی۔

ہم نے سطورِ بالا میں پاکستان کے قومی نظامِ تعلیم کے خدوخال بیان کیے ہیں۔ انہیں بہتر سے بہتر بنانے کی تدابیر کا دروازہ کھلا ہے۔ ماہرین تعلیم اور راہنمایانِ قوم وملت اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں اوپر دیے گئے خدوخال کے نتیجے میں برپا ہونے والے نظامِ تعلیم میں مزید نکھار پیدا کر سکتے ہیں۔

راقم الحروف نے جو نقشہ پیش کیا ہے وہ کوئی نیا نقشہ نہیں ہے۔ کم وبیش اسی طرح کے نکات مختلف ماہرین تعلیم، قومی اور ملی راہنما، دانشور اور تعلیمی تنظیمیں پیش کرتی رہی ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب تک ہم ان خطوط پر مبنی پاکستان کا قومی نظامِ تعلیم کیوں برپا نہیں کر پائے۔ اس سوال کا جواب کوئی سادہ سا جواب نہیں ہے بلکہ ایسا نہ کر سکنے کے کئی اسباب ہیں۔ سادہ سی تقسیم کے مطابق کچھ اسباب بیرونی ہیں اور کچھ اسباب اندرونی ہیں۔

بیرونی اسباب

ہم سب سے پہلے بیرونی اسباب پر نظر ڈالیں گے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم کوئی آزاد نظامِ تعلیم نہیں ہے بلکہ یہ دوسروں پر انحصار کرنے والا نظامِ تعلیم (Dependent Education System) ہے، جس کے سات پہلو ہیں جو جناب فرید العطاس (پروفیسر نیشنل یونیورسٹی سنگاپور) کے مطابق یہ ہیں:

۱۔ خیالات پر انحصار، ۲۔ خیالات کے ذرائع پر انحصار، ۳۔ تعلیم کی ٹیکنالوجی پر انحصار، ۴۔ تحقیق و تدریس کے لیے بیرونی امداد پر انحصار، ۵۔ محققین کی معلومات کے مراکز میں طلب پر انحصار، ۶۔ تعلیم میں سرمایہ کاری پر انحصار، ۷۔ تعلیمی، تحقیقی منصوبوں کی مغربی استعماری نظام کی طرف سے قدر شناسی پر انحصار

یہ سات نکات اس امر کا بخوبی احاطہ کرتے ہیں کہ ہمارا نظامِ تعلیم ابتدائی سطح سے اعلیٰ سطح تک کس

طرح مغرب منحصر (West Dependent) نظامِ تعلیم ہے۔ ان سات عوامل کے ہوتے ہوئے کوئی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ قرآن وسنت کے مطابق پاکستان کا قومی نظامِ تعلیم تشکیل پا سکے گا۔ یو ایس ایڈ، ورلڈ بنک، ایشین ڈویلپمنٹ بنک، یونیسکو، یونسیف، ڈی ایف آئی ڈی (DFID)، سیڈا (CIDA) اور اسی طرح کے مغربی ادارے اور این جی اوز محض گھوڑے ہیں جو مذکورہ بالا سات نکات کے لیے سواری کا کام دیتے ہیں۔ ہماری یونیورسٹیاں مغربی استعماری تعلیم کا سب سے بڑا وسیلہ ہیں اور بدقسمتی یہ ہے کہ اسلامسٹوں کی قائم کردہ یونیورسٹیاں بھی وہی کارِ بد انجام دے رہی ہیں جو سرکاری اور سیکولرسٹوں کی یونیورسٹیاں کر رہی ہیں۔

اندرونی اسباب

اب ہم آتے ہیں اندرونی اسباب کی طرف۔ ہم جن اندرونی اسباب کا ذکر کریں گے ان پر درجہ بدرجہ بیرونی اسباب کا ٹھپہ بھی لگا ہوا ہے کیونکہ یہ مغربی استعمار کے شکنجے میں جکڑی ہوئی غلامانہ ذہنیت ہے جو اندرونی اسباب میں نمایاں نظر آئے گی۔

اندرونی اسباب میں سب سے پہلے ہم تین اسٹیبلشمنٹس (Establishments) کا ذکر کریں گے جن میں ایک سول اسٹیبلشمنٹ، دوسری فوجی اسٹیبلشمنٹ اور تیسری مذہبی اسٹیبلشمنٹ ہے۔ اس وقت پاکستان کے نظامِ تعلیم پر سول بیوروکریسی یا سول اسٹیبلشمنٹ کا مکمل غلبہ ہے۔ ریوینیو (Revenue) جمع کرنے اور امنِ عامہ برقرار رکھنے کی تربیت پا کر عوام کی تقدیر کے مالک بننے والے بیوروکریٹس، تعلیمی پالیسی اور تعلیمی انتظام وانصرام پر حاوی ہیں۔ درس وتدریس اور علم وتحقیق کا تجربہ رکھنے والے ماہرینِ تعلیم ان بیوروکریٹس کے محض منشی بن کر رہ گئے ہیں اور اس حیثیت میں زندگی بھر جھڑکیاں کھاتے رہنا اہلِ علم کا مقدر بن گیا ہے۔ اب ان مالیہ اکٹھا کرنے اور امن وامان برقرار رکھنے کی مہارت رکھنے والے حضرات کے ذہن میں قومی نظامِ تعلیم جیسے ادق تصورات کیسے آئیں اور یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ قومی نظریہ کی روشنی میں تعلیمی حوالے سے صائب فیصلے کر سکیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بیرونی قوتوں کے مشیرانِ کرام اپنے اپنے قومی پس منظر کے ساتھ انہیں جو کچھ سمجھاتے ہیں وہ بغیر سوچے سمجھے سیاسی قیادتوں سے منظور کرا کر نافذ کر دیتے ہیں۔ شہباز شریف جیسا تعلیم کے لیے دلی درد رکھنے والا حاکم بھی پالیسی کی سطح پر ایسے ایسے مجہول فیصلے کرتا ہے کہ سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔ سول بیوروکریسی کا جال مرکزی اور صوبائی سیکرٹیریٹ سے ضلعی سطح تک اتنا مضبوط ہے کہ اس کو توڑنا بظاہر ممکن نظر نہیں آتا۔ فوجی اسٹیبلشمنٹ کے اپنے طریقے ہیں جن کو کام میں لا کر وہ مغربی استعماری نظامِ تعلیم کی سرپرست بنی ہوئی ہے۔ آرمی سکولز، گیریزن سکولز، کیڈٹ کالجز اور اسی طرح کے تعلیمی منصوبے ہمارے مطلوبہ نظامِ تعلیم کی راہ میں حائل ہیں

۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم نے صرف اتنا فیصلہ کیا کہ میٹرک تک تعلیم اور امتحان اردو میں ہوگا لیکن دو ہی سالوں میں ضیا الحق کی جرنیلی پارٹی اور جرنلز کی بیگمات نے اس فیصلے کا تیا پانچہ کر دیا۔ ہم نے تیسرا عامل مذہبی اسٹیبلشمنٹ کو کہا ہے جو قومی نظامِ تعلیم کی تشکیل میں ایک مئوثر رکاوٹ ہے۔ مسلکی اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر قائم موجودہ دینی مدارس ہماری مذہبی اسٹیبلشمنٹ کی طاقت اور اثر و رسوخ کا منبع ہیں۔ اوپر بیان کیے گئے قومی نظامِ تعلیم کے خدوخال کو سامنے رکھتے ہوئے یہ واضح ہے کہ اس میں مسلکی اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر قائم موجودہ دینی مدارس کی کوئی جگہ نہیں ہے کیونکہ پاکستان کے قومی نظامِ تعلیم میں دین و دنیا کی تفریق پر مبنی کسی ادارے کے قائم رہنے یا ہونے کا کوئی جواز نہیں ہو گا۔ اسی وجہ سے مذہبی اسٹیبلشمنٹ بھی قومی نظامِ تعلیم کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے۔

ناکامی کے اندرونی اسباب میں مجوزہ قومی نظامِ تعلیم کا مطالبہ کرنے والی، خواہش رکھنے والی، اور کسی حد تک اس کے لیے جدوجہد کرنے والی اسلامی قوتوں کی نالائقی، کاہلی اور کسی حد تک دوغلہ پن بھی قومی نظامِ تعلیم کی تشکیل میں کمزوری کا باعث ہے۔ آپ ذرا ایک دفعہ پھر پاکستان کے قومی نظامِ تعلیم کے مجوزہ خدوخال کو ذہن میں لائیں اور وہ جو اسلامی نظریہ حیات پر مبنی نظامِ تعلیم کا خواب دیکھتے ہیں اُن اسلامسٹوں کی یونیورسٹیوں کالجز اور سکول چینز (School Chains) کا اُن کے خواب کے ساتھ موازنہ کریں تو یہ خواب اُن کے لیے ایک ڈراؤنا خواب بن جاتا ہے جس کے مطابق اُن کی تعلیمی بادشاہتیں ہوا میں بکھرتی نظر آتی ہیں۔ اسلامسٹ شروع سے آخر تک تین برائیوں کے خلاف کم از کم قرار دادوں کی حد تک صف آرا رہے ہیں۔ ان میں ایک ہے تعلیمی تجارت، دوسری انگلش بطور میڈیم آف انسٹرکشن اور تیسری مخلوط تعلیم۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے اسلامسٹ بھائیوں نے اپنے زیر کنٹرول تعلیمی اداروں میں ان تینوں برائیوں سے صرفِ نظر کیا۔ رہ گیا نصاب تعلیم اور اساتذہ کی کیفیت تو اس کا تو ذکر ہی نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔ اس حوالے سے یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ اندرونی مزاحمتی اسباب میں ایک چوتھی اسٹیبلشمنٹ کا بھی ذکر شامل کر لیا جائے جسے ہم پرائیویٹ اداروں کی "اسلامی" اسٹیبلشمنٹ کہہ سکتے ہیں۔

کیا کیا جائے؟ پاکستان کے قومی نظامِ تعلیم کی تشکیل کے لیے پہلے ایک ایک کر کے گھر کے اندر کارفرما چاروں **اسٹیبلشمنٹس** کو تعلیم کے میدان سے نکالا جائے بلکہ انہیں مکمل طور پر بے دخل کر دیا جائے۔ دستور میں دیے گئے قومی نظامِ تعلیم کی بنیاد فراہم کرنے والی شقوں کو قومی تعلیمی ایکٹ کی شکل میں پارلیمنٹ سے منظور کرا کر ملک میں مجوزہ نظامِ تعلیم کو نافذ کیا جائے۔

یہ سب کچھ کرے گا کون؟

میری دانست میں یہ کام بنیادی طور پر تنظیم اساتذہ پاکستان کے کرنے کا ہے جو خود بھی اگرچہ پرائیویٹ سکولوں کی اسلامی اسٹیبلشمنٹ کا ایک چھوٹا سا جزو ہے اور جو ملک کی پوری تدریسی فورس کی صرف 0.2فی صد یعنی ایک ہزار میں دو افراد لیکن اگر تنظیم اساتذہ پاکستان یہ ٹھان لے،نتائج سے بے پروا ہو کر اور بیساکھیوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے اس ایک نکتے کو اپنی جدو جہد کا حصہ بنا لے تو یہ سعادت اس کے حصہ میں آسکتی ہے مگر کیسے؟اس سوال کا جواب تب دیا جائیگا جب تنظیم اساتذہ کی طرف سے عزم کا اظہار ہوگا۔

تعلیم و تربیت چوہدری رفاقت علی☆

علم الاسماء (۲)

آج تک جتنی بھی ایجادات ہوئی ہیں۔ وہ اسی علم الاسماء کی مرہون منت ہیں جو آدمؑ کو زمین پر بھیجنے سے پہلے انہیں ودیعت کر دیا گیا تھا......اس کے ساتھ ہی یہ حکم دیا تھا کہ زمین میں جا کر اس علم الاسماء کو استعمال میں لانا......اپنی زندگی (زمین) گزارنے کے لیے لیکن ایک بات یاد رہے کہ اس علم الاسماء سے بنائی گئی چیزوں کا استعمال......میری طرف سے آنے والے ''علم وحی'' کے تحت استعمال کرتا ہے۔ سامانِ زیست اور آسائش کے لیے جو بھی چیز اس علم الاسماء کے تحت بناؤ گے ......اس کا استعمال میری طرف سے آنے والی ''وحی'' کے مطابق کرو گے۔مثلاً روزی کماؤ گے......علم الاسماء کے تحت لیکن اس کا استعمال کرو گے ''علم وحی'' کے تحت......گویا روزی کمانے کے طریقے تو علم الاسماء ہی بتائے گا لیکن اس کا مصرف (حلال یا حرام) وہ ''علم وحی'' کے تحت کرو گے۔ایک اور مثال عرض کیے دیتا ہوں کہ انسان اپنی حفاظت کے لیے اسلحہ تیار کرتا ہے جس میں تیر،تلوار سے لے کر بندواق،ایٹم بم وغیرہ شامل ہیں تو انسان یہ چیزیں تیار کرے گا علم الاسماء سے کام لیتے ہوئے لیکن ان کا استعمال کرے گا ''علم وحی'' کے تحت یعنی ناحق کسی کو قتل نہیں کرے گا،کسی کے ساتھ اپنے اسلحہ کے زور پر زیادتی نہیں کرے گا......ہاں البتہ کسی کی طرف سے اپنے اوپر حملہ کی صورت میں ان تمام اسلحہ جات کو اپنی حفاظت کے لیے استعمال کرے گا۔

آدمؑ کے اس اکتسابی علم کے ذریعے......فطرت کے تمام اسرار اس پر منکشف ہو جائیں اور قواعدِ طبیعہ پر اسے تصرف حاصل ہو جائے......وہ ان کو اپنے قابو میں لے آئے......اور انہیں استعمال کرے۔

انسان نے سب سے پہلا ذریعۂ توانائی جو دریافت کیا وہ آگ تھا۔آج سے ہزاروں برس پہلے ہمارے کسی بڑے نے دیکھا کہ کوئی چٹان اوپر سے گری......پتھر سے پتھر ٹکرایا......تو اس میں سے

آ گ کا شعلہ نکلا......اس کا یہ مشاہدہ......آ گ پیدا کرنے کے لیے کافی ہو گیا۔ پتھروں کو آ پس میں ٹکراؤ اور آ گ پیدا کرلو۔ گو یا آ گ اس دور کی سب سے بڑی ایجاد اور اوّلین ذریعہ توانائی تھا۔

اب توانائی کہاں سے کہاں تک جا پہنچی...... پہلے اس آ گ نے بھاپ کی شکل اختیار کی۔ پھر ہم نے بجلی ایجاد کی اور اب ایٹمی توانائی حاصل کر لی۔ ایک عظیم ذمہ داری سونپنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے

☆ ماہر تعلیم، لاہور، 0333-4575158

انسان کو نہ صرف اختیار بلکہ علم بھی عطا فرمایا......اس سے انسان کی فرشتوں پر فضیلت اور برتری ثابت ہوتی ہے۔

نعیم صدیقیؒ کے مطابق قرآن نے یہ بھی بتایا گیا کہ انسان احسنِ تقویم یا بہترین ساخت پر پیدا کیا گیا ہے۔ اس حقیقت کو ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡهَا (الروم: ۳۰)

حسن تقویم (بہترین خدائی نقشہ فطرت) کا ایک مفہوم......جسمانی ساخت سے متعلق ہے...... جس میں قدوقامت کے علاوہ ...... یہ خصوصیات پائی جاتی ہیں کہ چوپایوں کے مقابلے میں انسان دو پیروں پر چلتا ہے اور اس کے دو ہاتھ...... اعلیٰ تر سرگرمیوں کے لیے فارغ رکھے گئے ہیں اس میں ☐ صَوَّرَكُمۡ فَاَحۡسَنَ صُوَرَكُمۡ (المومن: ۶۴) ترجمہ: تمہاری (آدم کی) صورت گری کی، اور تمہاری صورتوں کو اچھا بنایا) کا مفہوم بھی شامل ہے۔ ایسی صورت گری کی جو خوش آئندہ معلوم ہوتی ہے، تخلیق و ترتیب میں جمالیت ہے۔

احسنِ تقویم کا دوسرا مفہوم نفسیاتی ہے......اور یہی پہلو اہم ہے۔ اگر انسان علم (علّم آدم الاسماء کلھا) [اور سکھائے آدمؑ کو الاسماء سارے کے سارے]۔ اور ذرائع علم (سمع، بصر، فواد) حافظہ، قوتِ استدلال و استنباط، اخلاقی حاسہ یا قوت امتیاز خیر و شر، قوتِ متخیلہ اور قوتِ نطق وتکلم) سے محروم ہوتا......تو اس جسمانی ساخت کی خوبی بھی......اسے دوسرے حیوانات سے بہتر نہ بنا سکتی۔ بلکہ وہ نسبتاً مختصر جسم اور نرم و نازک کھال کی وجہ سے زیادہ مشکلات سے دوچار ہوتا اور جہدِ حیات میں بہت ہی کم تر درجے پر رہ جاتا...... انسان کی فطری فوقیت کا زیادہ اہم پہلو نفسیاتی ہے اور اس کی نفسیاتی قوتوں اور صلاحیتوں کا خزانہ بے بہا ہے۔

ابن الجصاص الحنفیؒ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو ساری چیزوں کے نام سکھائے یعنی اجناس

کے ان کے معانی کے ساتھ...... کیونکہ اسماء کے ذکر میں لفظ کے اندر عموم ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: **ثُمَّ عَرَضَھُمۡ عَلَی الۡمَلٰٓئِکَۃِ** کے اندر اس بات پر دلالت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی اولاد کے ناموں کا ارادہ کیا تھا...... جیسا کہ الربیع بن انس سے مروی ہے اور حضرت ابن عباسؓ اور مجاہدؒ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو تمام اشیاء کے نام سکھا دیئے۔ عَرَضَھُمۡ کی رو سے...... ذوی العقول کے اسماء تھے...... اس لیے (ھُمۡ) کی ضمیر ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتی ہے...... غیر ذوی العقول کے لیے استعمال نہیں ہوتی...... تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب ذوی العقول...... اور غیر ذوی العقول دونوں کا ارادہ کیا...... تو پھر ذوی العقول کے اسم کی تغلیب درست ہوگئی۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰہُ خَلَقَ کُلَّ دَآبَّۃٍ مِّنۡ مَّآءٍ فَمِنۡھُمۡ مَنۡ یَّمۡشِیۡ عَلٰی بَطۡنِہٖ وَمِنۡھُمۡ مَنۡ یَّمۡشِیۡ عَلٰی رِجۡلَیۡنِ وَمِنۡھُمۡ مَنۡ یَّمۡشِیۡ عَلٰۤی اَرۡبَعٍ (سورۃ النور: آیۃ نمبر ۴۵) ترجمہ: (اللہ ہی نے ہر چلنے والے جانور کو پانی سے پیدا کیا ہے، سو ان میں سے وہ بھی جو پیٹ کے بل چلتے ہیں اور وہ بھی جو دو پیروں پر چلتے ہیں اور وہ بھی جو چار پیروں پر چلتے ہیں)۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ حضرت آدمؑ کو تمام مختلف زبانوں کے اصول سے واقف کرا دیا گیا تھا...... اور اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ اصول...... ان کے معنی کے ساتھ سکھا دیئے تھے...... کیونکہ معنی کے بغیر اسماء کی معرفت کی کوئی فضیلت نہیں ہوتی۔ یہ بات علم کے شرف اور اس کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے۔

ابن الجصاص الحنفیؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ:

بعض لوگوں کا قول ہے کہ حضرت آدمؑ اور ان کی اولاد کی زبان طوفانِ نوح تک ایک ہی تھی۔ طوفانِ نوح میں سب غرق ہو گئے۔ صرف نوحؑ کی نسل سے زندہ رہ جانے والے بچے...... حضرت نوحؑ کی وفات کے بعد ان کی اولاد بڑھتی گئی اور تعداد زیادہ ہوگئی تو انہوں نے بابل میں ایک اونچا محل تعمیر کرنے کا ارادہ کیا...... تا کہ طوفان دوبارہ آئے...... تو اس محل کے ذریعے اپنا بچاؤ کر سکیں۔

اسی دوران اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان تحلیل کر دی اور ہر گروہ اپنی سابقہ زبان بھول گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے وہ زبانیں سکھائیں جو وراثت میں ان کی اولاد کو ملیں...... پھر یہ لوگ دنیا کے مختلف حصوں میں بکھر گئے اور نئے نئے شہر آباد کیے۔ بعض لوگ اس نظریہ سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کے مطابق ایک کامل العقل انسان کا اپنی وہ زبان بھول جانا ناممکن ہے جس میں وہ کل تک گفتگو کرتا تھا...... بلکہ حضرت نوحؑ کی اولاد مذکورہ تمام زبانیں جانتی تھی...... یہاں تک کہ یہ سب گروہ روئے زمین پر بکھر گئے...... اور ہر اک گروہ نے صرف اسی زبان پر انحصار کر لیا جس کے ذریعے آج ان کی بول چال ہوتی ہے۔ باقی ماندہ

تمام زبانیں ترک کر دیں جن کا انہیں علم تھا۔ ان کی اولاد نے یہ زبانیں ان سے نہیں سیکھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے بعد آنے والی نسلیں تمام زبانیں نہیں جانتی تھیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے مطابق، انسان کے علم کی صورت دراصل یہی ہے کہ وہ ناموں کے ذریعے سے اشیاء کے علم کو اپنے ذہن کی گرفت میں لاتا ہے۔ لہٰذا انسان کی تمام معلومات۔ دراصل اسمائے اشیاء پر مشتمل ہیں۔ حضرت آدمؑ کو سارے نام سکھانا۔ گویا ان کو تمام اشیاء کا علم دینا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر فرشتے اور فرشتوں کی ہر صنف کا علم صرف اسی شعبے تک محدود ہے جس سے اس کا تعلق ہے مثلاً ہوا کے انتظام سے جو فرشتے متعلق ہیں، وہ ہوا کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں مگر پانی سے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ یہی حال دوسرے شعبوں کے فرشتوں کا ہے۔

انسان کو اس کے برعکس جامع علم دیا گیا۔ ایک ایک شعبے کے متعلق چاہے وہ ان فرشتوں سے کم جانتا ہے مگر مجموعی اعتبار سے جو جامعیت انسان کے علم کو بخشی گئی ہے وہ فرشتوں کو میسر نہیں۔

ابن کثیرؒ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ایک خاص علم میں حضرت آدمؑ کو فرشتوں پر فضیلت دی۔ حضرت آدمؑ کو تمام نام بتائے یعنی ان کی تمام اولاد کے سب جانوروں کے، زمین، آسمان، پہاڑ، تری، خشکی، گھوڑے، گدھے، برتن، بھانڈے، چرند پرند، فرشتہ، ستارے وغیرہ تمام چھوٹی بڑی چیزوں کے۔

(عَرَضَهُنَّ) بھی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت میں ہے اور حضرت ابی بن کعبؓ کی قرأت میں (عَرَضَهَا) بھی ہے۔ (عَرَضَهُمْ) ذی عقل لوگوں کے لیے آتا ہے۔ صحیح قول یہی ہے کہ تمام چیزوں کے نام سکھائے تھے۔ ذاتی نام بھی صفاتی نام بھی، اور کاموں کے نام بھی، جیسے کہ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ گوز کا نام بھی بتایا گیا تھا۔

سید شبیر احمد عثمانیؒ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو ہر ایک چیز کا نام معہ اس کی حقیقت اور خاصیت کے اور نفع، نقصان کے تعلیم فرما دیا اور یہ علم ان کے دل میں بلا واسطہ کلام القاء کر دیا۔ کیونکہ اس کمال علمی کے بغیر خلافت اور دنیا پر حکومت کیوں کر ممکن ہے حتیٰ کہ حضرت آدمؑ کے احاطۂ علمی پر، فرشتے بھی عش عش کرنے لگے کیونکہ علم اللہ تعالیٰ کی صفتِ اعلیٰ ہے اس لیے قابلِ خلافت یہی ہوتے۔ ہر خلیفہ میں اپنے مستخلف عنہ کا کمال ہونا ضروری ہے۔

مولانا محمد عاشق الٰہی اپنی تفسیر نورالبیان میں کہتے ہیں کہ لفظ آدم کے بارے بعض مفسرین نے فرمایا کہ...... یہ ''عجمی'' لفظ ہے۔ جیسے آذر اور شالخ، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ ''عربی'' لفظ ہے جو

'اُدْمَةً' سے مشتق ہے۔ عربی میں یہ مادہ گندم گونی رنگ کے معنی دیتا ہے۔ حضرت آدمؑ کو سب چیزوں کے نام بتادیئے حتیٰ کہ چھوٹے، بڑے پیالے کا نام بھی بتادیا تھا۔

اس نئی مخلوق میں صفتِ علم، ایک ایسی بڑی چیز ہے جس کی وجہ سے زمین میں خلافت قائم کی جاسکتی ہے اور باقی بھی رکھی جاسکتی ہے۔ بغیر علم کے خلافت نہیں چل سکتی بلکہ کوئی بھی کام، علم کے بغیر صحیح طریقے سے نہیں ہوسکتا۔ صحیح عمل کے لیے صحیح علم کی ضرورت ہے اور صفتِ علم میں یہ نئی مخلوق (فرشتوں سے) بڑھ کر ہے۔

تسہیل البیان فی تفسیر القرآن میں مولانا محمد اسلم شیخوپوریؒ علم الاسماء کے بارے میں رقم طراز ہیں:

(۱) کائنات کے مظاہر وعناصر اور مخلوقات میں غور وفکر کرنا اور ان کے خواص وآثار کا معلوم کرنا یہ کسی طور پر بھی منصبِ نبوت وولادت کے منافی نہیں۔

(۲) اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ کسی کو دفعتہً بہت سا علم عطا فرمادے۔

(۳) علم اور عالم کو جہل اور جاہل پر فضیلت حاصل ہے (اگر کوئی چیز علم سے افضل ہے تو اللہ تعالیٰ اسی کے ذریعے انسان کے فضل وکمال کو ظاہر فرماتا)

(۴) جو کسی چیز کا دعویٰ کرے اس سے اپنے دعویٰ پر دلیل کا مطالبہ کیا جائے گا۔

(۵) خالق کا کوئی فیصلہ حکمت سے خالی نہیں۔ یونہی ساری مخلوقات کا علم محدود جبکہ خالق کا علم لامحدود ہے۔

(۶) جس شخص سے ایسی چیز کے بارے میں سوال کیا جائے، جسے وہ نہ جانتا ہو تو اسے چاہیے کہ ''واللہ اعلم'' کہہ دے۔ یہ سنت ہے ملائکہ کی، انبیاءؑ اور علماء کرام کی۔

(۷) علم کو عبادت پر اور آدمؑ کو ملائکہ پر فضیلت حاصل ہے اور یہ فضیلت بھی علم کی وجہ سے ہے۔

یہ ہیں چند ایک 'علم الاسماء' سے اخذ کردہ حکمت وہدایت کے موتی۔

پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ ضیاء القرآن میں رقم طراز ہیں:

علم الاسماء کے حوالے سے حضرت ابن عباسؓ، عکرمہ اور ابن جبیرؓ نے اس آیت کی تفسیر یوں کی ہے: علمہ اسماء جمیع الاشیاء کلھا جلیلھا وحقیرھا (القرطبی) یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو

چھوٹی بڑی تمام اشیائے کے سب نام سکھا دیئے اور خلافت کے منصب کا تقاضا بھی یہی تھی کہ انہیں تمام چیزوں کا علم عطا فرمایا جاتا۔

حافظ عبدالسلام بن محمد تفسیر القرآن الکریم میں علم الاسماء کے بارے میں فرماتے ہیں کہ کسی ورکشاپ کی ذمہ داری سپرد کرتے وقت یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کے اوزاروں کا علم کون رکھتا ہے، ظاہر ہے انہیں وہی استعمال کرسکتا ہے جو کم از کم ان کے نام جانتا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کی اشیاء کے نام حضرت آدمؑ کو سکھائے اور فرشتوں پر واضح کیا کہ زمین کی خلافت کے لیے صرف تسبیح و تقدیس کافی نہیں بلکہ علم الاسماء بھی ضروری ہے۔ جو حضرت آدمؑ کو عطا کیا گیا ہے، فرشتوں کو نہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ: اپنی تفسیر 'تدبر قرآن' میں ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو کن کے نام سکھائے؟ اس سوال کے جواب میں تین اقوال ہیں:

(۱) اس سے مراد تمام چیزوں کے نام ہیں۔

(۲) اس سے مراد فرشتوں کے نام ہیں۔

(۳) اس سے مراد حضرت آدمؑ کی ذریت کے نام ہیں۔

وہ خود ہی تحریر فرماتے ہیں کہ دوسرے قول کی تائید میں ...... قرآن حکیم میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ باقی دو اقوال میں سے تیسرا قول ان کے نزدیک زیادہ قوی ہے جس کی وجوہات درج ذیل ہیں:

(۱) قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسماء پر الف لام عہد کا ہے۔ اگر اسے عہد کا الف لام مان لیا جائے تو پھر اس سے کچھ خاص ناموں ہی کا مراد لینا صحیح ہوگا۔

(۲) اس کے لیے ضمیریں اور اشارے جو استعمال ہوئے ہیں وہ تمام تر وہ ہیں جو عربی زبان میں عام چیزوں کے لیے نہیں بلکہ خاص طور پر عقل وادراک اور شعور و ارادہ رکھنے والی چیزوں کے بارے، استعمال ہوتے ہیں مثلاً ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰئِكَة (تو جب ان کو، ان کے ناموں سے آگاہ کیا)۔

(۳) یہاں موقع فرشتوں کے قائل کرنے کا ہے۔ فرشتے حضرت آدمؑ کی ذریت کے بارے میں یہ گمان رکھتے تھے کہ یہ خلافت پا کر زمین میں فساد مچائے گی اور خونریزی برپا کرے گی۔ ان سے گمان کی تردید (اگر ہوسکتی تھی تو اسی طرح ہوسکتی تھی) کہ ان کو ذریت آدمؑ کا مشاہدہ کرا دیا جائے اور اولادِ آدم میں جو انبیاء ورسل، مجددین و مصلحین اور شہداء وصدیقین پیدا ہونے والے تھے۔ ان سے، ان کو (فرشتوں) آگاہ کیا جائے تاکہ انہیں معلوم ہوسکے کہ اولادِ آدم کے اندر ایسے لوگوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے جو

اللہ تعالیٰ کے تفویض کردہ اختیارات کو بے جا طور پر استعمال کریں گے تو ساتھ ہی ان کے اندر ایسے لوگ بھی اُٹھیں گے جو خود بھی اس ذمہ داری کا حق ادا کریں گے اور دوسروں کو بھی ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔

یہ تینوں مجموعی طور پر مل کر نہایت مضبوط دلیل اس بات کی بن جاتی ہیں کہ اسماء سے مراد، حضرت آدمؑ کی ذرّیت کے نام اور خاص طور پر ان لوگوں کے نام ہیں جو دنیا میں فساد کو مٹانے اور عدل کو قائم کرنے کے لیے آنے والے تھے۔ اس کا ذکر قرآن حکیم میں موجود ہے۔ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْم بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ وَاَشْھَدَھُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی شَھِدْنَا (سورۃ اعراف: ۱۷۲) 'اور یاد کرو جب کہ تیرے رب نے تمام بنی آدم کو ان کی پیٹھوں سے ان کی ذریت کو نکالا اور ان کو خود، ان کے اوپر، گواہ بنایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، انہوں نے اقرار کیا کہ ہاں! ہم گواہ ہیں۔ دنیا میں بھیجنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے عالم غیب میں ایک مرتبہ نسلِ آدمؑ کے ایک اجتماع عام میں ان سے اپنی ربوبیت کا اقرار کرایا ہے۔ اسی اجتماعِ عام میں آدمؑ کو ان کی ذرّیت کے نام بھی بتائے گئے ہوں گے اور اسی موقع پر فرشتوں کے سامنے ان کو پیش کر کے وہ سوال و جواب بھی ہوا ہوگا۔

جس کا حوالہ یہ ہے اَنْبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ ھٰٓؤُلَآءِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (یعنی اگر تم اس گمان میں سچے ہو...... کہ اولادِ آدمؑ خلافت پا کر سرزمین پر فساد برپا کرنے لگی تو ان لوگوں کے نام بتاؤ کہ یہ کون لوگ ہیں۔ یہ زمین میں فساد برپا کرنے والے ہیں یا اس میں امن اور عدل کرنے والے ہیں؟)

مولانا صوفی عبدالحمید سواتیؒ اپنی تفسیر معالم العرفان و دروس القرآن میں 'علم الاسماء' کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس سے مراد انواع و اجناس کے نام ہیں جو اللہ تعالیٰ نے سکھلائے۔ اس سے مراد ہر فرد کا نام سکھلانا نہیں کیونکہ ہر فرد اور جزو کا تعلق غیب سے ہے اور اسے صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور کوئی نہیں جانتا۔

انواع و اجناس کا مطلب...... جیسے انسان ایک نوعی نام ہے اسی طرح اجناس میں سے حیوان ایک جنس ہے۔ پھر بہت سی قسمیں ہیں مثلاً گھوڑے، بھینسیں، گائے، بھیڑ، بکریاں، کیڑے مکوڑے وغیرہ۔

بعض مفسرین کے مطابق...... اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کی قیامت تک پیدا ہونے والی اولاد کے نام بتلا دیے۔ اس کے برخلاف شیخ محی الدین ابن عربی کی رائے میں ان اسماء سے مراد اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنیٰ ہیں نہ کہ بعض دوسری چیزوں کے نام۔

بعض مفسرین کے مطابق...... اسماء سے مراد جزئیات ہیں مگر تمام کی تمام اور ہر قسم کی جزئیات نہیں

بلکہ صرف وہ جزئیات مراد ہیں جن کی ضرورت تھی۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ صرف انسانی ضروریات کی تمام چیزوں کے نام بتلا دیئے جو چیزیں انسانی ضرورت سے باہر ہیں ان کے بتانے کا کوئی فائدہ نہ تھا اور نہ وہ بتائیں۔قرآن حکیم میں اس کی مثال سورہ نمل میں آتی ہے کہ ملکہ سبا کو (وَ اُوْتِیَتْ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ) ہر چیز دی گئی تھی تو یہاں پر اس سے مراد سلطنت کی ضروریات ہی ہیں۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس زمانے میں ملکہ سبا کے پاس فینٹم طیارے اور راکٹ بھی موجود تھے بلکہ ضرورت کی تمام اشیاء اسے میسر تھیں۔تو یہاں پر بھی الاسماء کلھا سے مراد انہی چیزوں کے نام ہیں جو انسانی ضروریات میں شامل ہیں۔اسی طرح سورہ نحل میں شہد کی مکھیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ (پھر تمام پھلوں سے کھاؤ اور شہد پیدا کرو)۔اللہ تعالیٰ نے اس کی فطرت میں ایک پاکیزہ چیز رکھ دی ہے؟ اور اس کے پیٹ میں ایک لطیف قسم کا مادہ پیدا کر دیا ہے جس سے شہد بنتا ہے۔تو یہاں پر تمام قسم کے پھل کھانے سے مراد یہ نہیں ہے کہ دنیا جہان کا ہرا چھا، بُرا، کڑوا، کسیلا پھل کھائے...... بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس کی ضرورت اور رسائی کے مطابق جتنے پھل ہیں مکھی ان پر بیٹھتی ہے اور پھر اس سے اللہ تعالیٰ شہد جیسی مفید چیز پیدا کرتا ہے۔بادام اور اخروٹ وغیرہ ایسے پھل ہیں جن کے مغز تک رسائی ممکن ہی نہیں تو ایسی چیزوں سے کھانے کا حکم اللہ تعالیٰ نے نہیں دیا۔

اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی کی فطرت میں یہ ضابطہ رکھ دیا ہے کہ وہ پاکیزہ چیزوں پر بیٹھتی ہے......گندی جگہ پر نہیں بیٹھتی۔مشاہدے سے معلوم ہوا کہ اگر شہد کی مکھی غلاظت والی جگہ پر بیٹھ جائے اور اس کا پتہ چل جائے تو مکھیوں کی ملکہ کے پاس شکایت پیش ہوتی ہے اور ایسی مکھی کو سزائے موت دے دی جاتی ہے۔

پھلوں میں بعض کڑوے پھل ہوتے ہیں مگر مکھی وہاں سے مادہ حاصل کرنے کی پابند نہیں۔اسی طرح بعض پھول بدبودار ہوتے ہیں جو شہد کے لیے ناموافق ہوتے ہیں۔اگرچہ ہوتے وہ پھول ہی ہیں جس قسم کے پھل یا پھول سے مکھی رس چوسے گی۔شہد کا ذائقہ بھی ویسا ہی ہوگا مثلاً کھجور پر بیٹھے گی تو وہ ذائقہ حاصل کرے گی، انگور کی شاخ پر جائے گی تو ویسی ہی مٹھاس حاصل کرے گی۔مکھی کے ہر پھل اور پھول چوسنے سے مراد صرف وہ پھل اور پھول ہیں جو اس کی شہد کی ضرورت سے مناسبت رکھتے ہیں۔

بعض مفسرین کے مطابق 'عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسَمآءَ كُلَّهَا' سے مراد انسانی ضروریات کی تمام چیزیں ہیں، ان میں غیر ضروری اشیاء کے نام مراد نہیں۔عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں ہانڈی، چمچہ وغیرہ چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں مگر چونکہ ان کا تعلق ضروریاتِ انسانی سے ہے اس لیے ان کے نام حضرت آدمؑ کو بتلائے

گئے۔

امام ابوبکر جصاصؒ اور بعض دوسرے مفسرین کے مطابق چیزوں کے نام سکھانا ایسے نہیں تھا جیسے بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے مثلاً ب سے بلی، ط...... بلکہ سکھانے سے مراد اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی طبیعت اور مزاج میں بطورِ صلاحیت ....ان چیزوں کے نام رکھ دیے۔

موانا عبدالرشید مدظلہ العالیٰ تفسیر توضیح القرآن میں 'علم الاسماء' کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ:

اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی فضیلت اور بزرگی فرشتوں پر علم کی وجہ سے ظاہر فرمائی کہ مقابلہ کے وقت فرشتے چیزوں کے نام نہ بتا سکے اور آدم علیہ السلام نے بتا دیے۔ ابن عباسؓ نے کہا کہ ان کی اولاد کے اور سب جانوروں کے نام بتائے اور سب چیزوں کے یہاں تک کہ دیگچی، رکابی اور ہر چھوٹی بڑی چیز، اسماء سے مراد صرف نام نہیں بلکہ اشیاء کی حقیقت، اوصاف اور خواص مراد ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ نے آدمؑ میں ہر چیز جاننے کا مادہ اور قابلیت پیدا کر دی تھی کہ جب توجہ کرے جان سکے۔ اگر یہ شبہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے معاذ اللہ دھوکا کیا کہ ان کے مقابل آدمؑ کو نام بتا دیے اور مقابلہ کرایا۔ اگر یہی نام فرشتوں کو بتلا دیتا تو وہ بھی بتا سکتے تھے تو اس میں آدمؑ کی کونسی بزرگی ہے؟ ازالہ اس کا یوں ہے کہ فرشتوں نے اپنی پاکی اور بزرگی جتلانے کے علاوہ ہمہ دانی کا دعویٰ بھی کیا تھا یعنی **نسبح بحمدک و نقدس لک** کے علاوہ **نعلم الاشیاء کلھا** بھی کہا تھا۔ اس لیے اختلاف کے لیے صرف زہد اور بزرگی ہی لازم نہیں جب تک ثبوت علمی نہ ہو۔ قرینہ اس کا یہ ہے کہ فرشتوں کے دعویٰ تقدیس اور زہد پر تو جناب باری تعالیٰ کی طرف سے **انبؤنی باسماء ھولاء ان کنتم صادقین** ارشاد ہے۔ اگر فرشتوں کی طرف سے علم کا دعویٰ نہ ہوتا تو انبؤنی سے کیوں سوال کیا جاتا وہ بجائے 'لاعلم لنا' کہنے کے یہ کہتے کہ صاحب اس سوال کا یہاں کیا مقام؟ دعویٰ ہمارا زہد ہے اور سوال ہم سے علم کا پس ارشاد انبؤنی اور **ان کنتم صادقین** تب ہی درست اور مناسب ہوسکتا ہے کہ جب فرشتوں نے دعویٰ علمیت بھی کیا ہو، جس کے جواب میں غلط فہمی رفع کرنے کے لیے یہ ضروری ہوا کہ حضرت آدمؑ کو سب نام سکھائے جائیں تاکہ انہیں معلوم ہو کہ بہت سے امور ایسے بھی ہیں جنہیں ہم نہیں جانتے جبھی تو اس الزام کے بعد ملائکہ '**سبحانک لاعلم لنا الا ماعلمتنا**' پکار اُٹھے اور اپنے نقصان علم کے معترف ہوئے۔ حاصل یہ کہ آدمؑ کو ان کی فطرت اور ضروریات کے مطابق مناسب علم دیا اور فرشتوں کو ان کی فطرت کے مطابق مناسب علم دیا ہوا تھا چنانچہ وہ '**الا ماعلمتنا**' میں خود اقرار کرتے ہیں خلافت چونکہ زمینی اشیاء کے متعلق تھی پس ان اشیاء کو کن کہہ کر پردۂ عدم سے ظاہری وجود میں لا کر ان کے سامنے پیش کر کے امتحان لیا تو آدمؑ کا علم ان

اشیاء کے مطابق تھا اس لیے خلافت اس کے سپرد کر دی گئی اس میں نہ کسی کی بے جا رعایت ہے اور نہ کسی سے بے اعتنائی۔

اکبرالٰہ آبادی

دورغلامی میں اکبرالٰہ آبادی نے کہا تھا کہ 'یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا۔افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی'اگر اکبر آج کی سیکولر آزادی کے دور میں ہوتے تو شائد جدید سکول، کالج اور یونیورسٹی چلانے والوں کے خلاف دفعہ ۳۰۲ کا پرچہ کٹوا دیتے۔

دینی منہج ڈاکٹر محمد امین

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق اور ملک احمد سرور صاحب کے درمیان مکالمہ

غلبۂ دین کا صحیح منہج ۔دعوت یا جہاد؟

البرہان کے صفحات میں برادرم ڈاکٹر عبدالغنی فاروق صاحب اور محترم ملک احمد سرور صاحب کی بحث قارئین نے ملاحظہ کی۔ڈاکٹر صاحب کا موقف یہ ہے کہ مسلمان مغرب سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے جب کہ مغرب مسلمانوں کو کچلنے پر ادھار کھائے بیٹھا ہے لہٰذا مسلمانوں کو مکی دور کی طرح مزاحمت کرنے اور دشمن کے دوبدو آنے کی بجائے پسپائی اختیار کر لینی چاہیے اور دعوت کو ہتھیار کے طور پر استعمال کر کے مغرب کو زیر کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جب کہ ملک صاحب کا موقف یہ ہے کہ ظالم کی مزاحمت اور اس کے خلاف جہاد کا حکم ہمیں قرآن وسنت نے دیا ہے لہٰذا ہم اللہ ورسول کے حکم میں تبدیلی کے مجاز ہی نہیں اور نہ ہم مکی دور کی طرح بے بس ہیں۔بیچ میں ہم نے دخل اندازی کی اور یہ کہا کہ دعوت اور جہاد میں کوئی تضاد نہیں اور ہم دونوں کو ساتھ لے کر چل سکتے ہیں لیکن دونوں احباب نے اس پر توجہ نہیں دی اور اپنے اپنے موقف کی حمایت پر ڈٹے ہوئے ہیں لہٰذا اب ہم اپنا موقف ذرا وضاحت سے قارئین کے سامنے رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر فاروق صاحب کی اپنے موقف کے حق میں شرعی دلیل یہ ہے کہ مکی دور میں آنحضرت ﷺ اور آپ کے ساتھیوں نے کفار کا دوبدو مقابلہ نہیں کیا۔وہ خاموشی سے ظلم سہتے رہے اور برداشت کرتے رہے اس لیے کہ قرآن نے انہیں مزاحمت اور مقابلے کا حکم نہیں دیا تھا جیسا کہ متعدد احادیث سے

صراحت ہوتی ہے اور خود قرآن حکیم کے الفاظ سے بھی اسی کا اندازہ ہوتا ہے کیونکہ جہاد کے سلسلے میں جو پہلی آیت اتری وہ یہ تھی کہ ” اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ “ (الحج ۲۲:۳۷) یعنی اجازت دے دی گئی (قتال کی) ان لوگوں کو جن پر ظلم کیا جارہا ہے اور جنہیں قتل کیا جارہا ہے......اس سے صاف ظاہر ہے کہ پہلے ان کو اجازت نہ تھی۔ اب اگر اس ممانعت کی حکمت و مصلحت پر غور کریں تو وہ صاف نظر آتی ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں اتنی سکت ہی نہیں تھی کہ وہ قتال کرکے کوئی دینی فائدہ حاصل کرتے۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برسوں کی محنت سے جو سو دو سو آدمی مسلمان ہوئے تھے اگر اس وقت ان کو کفار سے لڑا کر ختم کر دیا جاتا تو اشاعت اسلام کی تحریک وہیں ختم ہوجاتی اور خدانخواستہ پیغمبر کا مشن ناکام ہوجاتا۔ تاہم جوں ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ پہنچے، اوس وخزرج آپؐ کے ساتھ مل گئے، یہود کے ساتھ آپ نے معاہدہ کرلیا اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سرداری کو تسلیم کرلیا اور گویا آج کی اصطلاح میں وہاں ایک اسلامی ریاست قائم ہوگئی تو اھ ہی میں مسلمانوں کو قتال کی اجازت دے دی گئی حالانکہ ابھی مسلمانوں کی حالت خاصی پتلی تھی۔ ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی معاشی بحالی کا مسئلہ درپیش تھا، نئے حالات، نئے موسم، نئی دوستیاں، کفار کے حملے کے خدشے کی وجہ سے امن وامان کی حالت مخدوش گویا ابھی مسلمانوں نے سکھ اور سکون کا سانس لیا ہی تھا کہ اھ میں قتال کی اجازت دے دی گئی اور ۲ھ میں غزوۂ بدر سے بھی پہلے قتال کا باقاعدہ حکم دے دیا گیا اور وہ بھی کسی شان سے، ذرا الفاظ ملاحظہ کیجیے:

”وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ ... وَ اقْتُلُوْھُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْھُمْ وَ اَخْرِجُوْھُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْکُمْ وَالْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ... وَقٰتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّ یَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ...“(البقرہ ۲:۱۹۰-۱۹۳)

’اورتم اللہ کی راہ میں لڑو اور ان لوگوں سے جو تم سے لڑتے ہیں......ان سے لڑو جہاں بھی تمہارا ان سے مقابلہ پیش آئے اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے کہ فتنہ قتال سے بھی زیادہ برا ہے......ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور سارا دین اللہ ہی کے لیے ہوجائے۔‘

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہؓ نے اس حکم پر اس طرح عمل کیا کہ ایک جنگ میں پہننے کے لیے جوتے نہ تھے تو صحابہ نے پیروں پر کپڑے لپیٹ لیے جو پھٹ کر دھجیاں بن گئے تو اس مہم کا نام ہی ’ذات الرقاع‘ پڑ گیا اور موتہ میں صحابہ کا تین ہزار کا لشکر کفار کے اڑھائی لاکھ کے لشکر سے بھڑ گیا، قادسیہ میں مسلمانوں نے اپنے سے دگنے اور یرموک میں تین گنا رومیوں کو شکست دی۔

اب آج دیکھیے ۵۷ آزاد مسلم ممالک جن کی آبادی (اقلیتوں سمیت) دو ارب کے قریب ہے جن میں سے ہر ایک کے پاس پیشہ ور فوج ہے اور ایک ملک تو نیوکلیئر طاقت بھی ہے، ان کو آپ کہتے ہو کہ تم مکی عہد میں ہو، یہ تو کمال ہے۔ فقہی اصطلاح میں اسے کہتے ہیں قیاس مع الفارق۔ پھر اور سوچیے! ہم کہتے ہیں کہ آپ کو لڑنے کی بھی ضرورت نہیں۔ شرق اوسط کے ممالک اپنا تیل، بنگلہ دیش اپنا پٹ سن اور ملائیشیا اپنا ربڑ اہل مغرب کو بیچنا بند کر دیں۔ مسلم ممالک امریکی ڈالر سے وابستگی ختم کر کے اپنی کرنسی بنا لیں اور امریکی و یورپی بنکوں سے اپنا 'سرمایہ نکلوا لیں' تو امریکہ و یورپ دو ہفتوں میں آپ کے قدموں میں ہوں گے، آپ کو لڑنے کی ضرورت ہی نہیں۔ درحقیقت آپ کو صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک مضبوط ایمان کی اور دوسرے مغرب کی ذہنی غلامی سے نکلنے کی اور یہ دونوں کام دعوت و اصلاح اور تعلیم و تزکیہ کے ذریعے کرنے کے ہیں جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے کیے اور آپ ﷺ نے جو افراد تیار کیے انہوں نے ہی اسلامی معاشرے اور ریاست کے قیام سے اجتماعی زندگی کی بھی کایا پلٹ دی۔ فرق یہ ہے کہ آج مسلم معاشرہ اور ریاست پہلے سے موجود ہے لہٰذا اگر ہم دعوت و اصلاح اور تعلیم و تزکیہ سے فرد کو بدل دیں، اس کی اصلاح کر دیں تو یہ فرد آج بھی معاشرہ اور ریاست کو بدل دے گا جیسا اس نے عہد نبوی میں بدلا تھا۔ لہٰذا ہماری اصل ضرورت دعوت و اصلاح کے ذریعے فرد کی تبدیلی کی ہے۔ اسی طرح یورپ و امریکہ اور غیر مسلموں تک دین کی دعوت پہنچانے کے لیے بھی ہمیں دعوت و تبلیغ کی ضرورت ہے۔ اس لیے دعوت و تبلیغ کی اہمیت اپنی جگہ ہے اور اس سے صرف نظر کر کے کوئی معرکہ سر نہیں کیا جا سکتا۔

جہاد

جہاں تک جہاد کا تعلق ہے تو وہ دو قسم کا ہوتا ہے: اقدامی اور دفاعی۔ اقدامی جہاد کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی کافر حکومت اپنے عوام کے قبول اسلام میں مانع ہو تو اس کی قوت توڑ دی جائے تاکہ وہاں کے عوام میرٹ پر اسلام کے قبول کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کر سکیں۔ چونکہ مسلمان اس وقت اتنی طاقت نہیں رکھتے کہ کسی غیر مسلم حکومت کی قوت اس مقصد سے توڑ سکیں اس لیے وہ اقدامی جہاد کے مکلف ہی نہیں۔ جہاں تک دفاعی جہاز کا تعلق ہے تو وہ اس وقت فرض ہوتا ہے جب کوئی کافر حکومت کسی مسلم ملک پر حملہ کر دے۔ یہاں چوائس مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتی ہی نہیں کہ وہ جنگ کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کریں بلکہ یہ کنجی تو مسلم دشمن امریکہ و یورپ اور ان کے حلیفوں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ کسی مسلم ملک پر جنگ مسلط کر دیتے ہیں تو کیا مسلمان مدافعت بھی نہ کریں اور ہاتھ جوڑ کر اور سر جھکا کر کہیں کہ لو صاحب! گردن حاضر ہے۔ یہ کس دین میں لکھا ہے اور کس شریعت کا حکم ہے؟ مغرب اور اقوام متحدہ کا قانون بھی اپنی مدافعت کی اجازت دیتا ہے۔ کیا ڈاکٹر صاحب چاہتے ہیں کہ جہاں بھی کفار حملہ آور ہوں وہاں مسلمان سرنڈر کر دیں اور

غلامی قبول کرلیں؟ کون صحیح الدماغ آدمی یہ کہہ سکتا ہےاورکون ان کی بات قبول کرے گا؟

ہم مشہور یورپی فلسفی نطشے کی بات نہیں کرتے جس نے اخلاق کی دو قسمیں کی ہیں: غلاموں کے اخلاق اورآقاؤں کے اخلاق۔قناعت،توکل،صبر رواداری بزدلی عدم تشدد وغیرہ کووہ غلاموں کے اخلاق میں شمار کرتا ہےاور شجاعت،تہور،غضب اوراقدام وغیرہ کووہ آقاؤں کے اخلاق گردانتا ہے۔گویا نطشے کی رو سے ڈاکٹر فاروق صاحب ہمیں غلاموں کے اخلاق قبول کرنے پر ابھار رہے ہیں......لیکن نطشے کو چھوڑیے کہ بعض احادیث اورخلفائے راشدین کے اقوال کا مطلب بھی یہی ہے کہ اگر مسلمان جہاد چھوڑ دیں گےتو ذلت ومسکنت ان کا مقدر ٹھہرے گی۔ ایسا کیوں ہے؟اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ دل ودماغ کو بدلنے والی چیز دعوت ہے لیکن باطل (اوراس کے علم برداروں کے ذاتی اور گروہی مفادات) حق کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرتا اور بھرپور مزاحمت کرتا ہے اورحق بھی اپنے آپ کو غالب کرنا چاہتا ہے۔(هُوَ الَّذِيٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَ دِيۡنِ الۡحَقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ وَ لَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ) لہٰذا بات دعوت سے شروع ہوتی ہے لیکن دعوت پہ ختم نہیں ہوتی بلکہ جہاد پہ ختم ہوتی ہے۔اب جہاد کے لیے تیاری کی ضرورت ہے جو دعوت کے امن وسکون سے مختلف چیز ہے۔اسے ایک روزمرہ کی مثال سے سمجھیے۔ایک شخص کی صحت کمزور ہےاوروہ گھر میں بیٹھا رہتا ہے۔ڈاکٹر اسے کہتے ہیں کہ چلا پھرا کرواور سیر کیا کرو۔اب اگر یہ شخص ہر وقت گھر میں پڑا رہتا ہےتو بظاہر اس عدم مشقت میں آرام ہے لیکن درحقیقت یہ شخص اپنی صحت تباہ کررہا ہےاوراس عدم مشقت کا نتیجہ ایک دن مستقل عدم حرکت (یعنی اس کی موت) پر منتج ہوگا اور اگر یہ شخص سیر شروع کردے گاتو بظاہر اسے تھکاوٹ اور مشقت محسوس ہوگی لیکن اگروہ مستقل مزاجی سے سیر کرتا رہے،اس کے دورانیے کوتھوڑا تھوڑا بڑھاتا رہےاور بالآخر جاگنگ اور ہلکی پھلکی ورزش پرآجائےتو اس کی صحت بہتر ہوجائے گی،وہ چاک وچوبند ہوجائے گا۔اس کی زندگی میں نشاط آجائے گی اوروہ زندگی کی ہر قسم کی تگ ودو میں کامیابی سے حصہ لے سکے گا۔

بالکل یہی حالت اس وقت مسلمانوں کی ہےاور ڈاکٹر فاروق صاحب ٹھیک کہتے ہیں کہ وہ کمزور و نحیف ہیں اورکوئی معرکہ سر کرنے کے قابل نہیں لیکن جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں کمزور آدمی کی مثال دی کہ اس کا حل یہ نہیں ہے کہ وہ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جائیں اور باتوں سے دشمن کو فتح کرنے کی کوشش کریں بلکہ اس کا حل یہ ہے کہ وہ ضرورت پڑنے پر جرأت وشجاعت سے کام لیں اورآہستہ آہستہ قوی ہوتے جائیں یہاں تک کہ دشمن کو یقین ہوجائے کہ اگر اس شخص پر ہاتھ اٹھایا تو ہڈی پسلی ایک کردے گا،پھرہی وہ جارحیت سے بازآئے گا۔دور کیوں جائیں،ہمارے ہمسائے افغانستان کی مثال ہمارے سامنے ہے اورہم اس کے عینی شاہد ہیں کہ افغان طالبان نے سرنڈر نہیں کیا اور حسبِ استطاعت جہاد جاری رکھا۔اب دس سال بعد نتیجہ یہ نکلا ہے کہ امریکہ ونیٹو بھاگ رہے ہیں اور طالبان کامیاب وفتح یاب ہیں۔لیکن اس

کے لیے قربانیاں دینی پڑی ہیں جان کی اور مال کی۔ اگر ڈاکٹر فاروق صاحب کے مشورے پر عمل کیا جاتا کہ ہم کمزور ونحیف ہیں اور ہم پورے یورپ و امریکہ سے لڑ کر کیسے کامیاب ہوسکتے ہیں؟ تو ظاہر ہے طالبان نہ کبھی لڑ سکتے اور نہ کامیاب ہو سکتے۔ اس کے برعکس پاکستان کی مثال بھی موجود ہے کہ ائیر فورس، نیوی اور لاکھوں کی تربیت یافتہ فوج کی موجودگی میں اس کے حکمران جرنیل نے (اقتدار و ڈالرز کی محبت میں) بزدلی اور ہزیمت کی بدترین مثال قائم کرتے ہوئے دھمکی کے ایک فون پر سرنڈر کر دیا اور آج دس سال بعد بھی یہ حالت ہے کہ ہم امریکہ کے غلام ہیں اور پاک فوج اس کی خواہش پر دشمن سے لڑنے کی بجائے اپنے ہی علاقے فتح کر رہی ہے۔

ڈاکٹر فاروق صاحب چین کی مثال دے سکتے ہیں جس نے یہ پالیسی اپنائی ہے کہ جنگ سے بچو، جھگڑوں میں نہ پڑو اور تیز رفتار ترقی کر کے آگے نکل جاؤ اور وہ اس حکمت عملی میں کامیاب ہے لیکن جناب چین کمزور نہیں طاقتور ہے اور اس کا کوئی ایسا دشمن بھی موجود نہیں ہے جو اسے مٹانے پر تلا ہوا ہو لہٰذا مسلمان چین والی پالیسی، اپنانا چاہیں بھی تو نہیں اپنا سکتے کیونکہ مغرب ہمیں مٹانے پر تلا ہوا ہے، وہ نہیں چاہتا کہ ہم اٹھیں، ترقی کریں اور کامیاب ہوں۔ اس کا حل یہ نہیں کہ ہم روباہی اختیار کر لیں اور کشمکش و مزاحمت سے بچنے کی کوششیں کریں بلکہ اس کا حل یہ ہے کہ ہم بھی اپنے مسل مضبوط کریں اور جو ہمارا بازو مروڑے، ہم اس کا بازو مروڑ دیں اور جب تک ہم اس قابل نہیں ہوتے اُس وقت تک اپنے مسل مضبوط کرتے رہیں۔ اس کا حل یہ نہیں ہے کہ ہم سر نیہوڑا کر کہیں کہ مہاراج! ہماری کھیتیاں اور ہماری عورتیں حاضر ہیں۔ ہم تو امن کے بچاری اور عدم تشدد کے نام لیوا ہیں۔ ہم تو آپ کو پرامن دعوت سے مسلمان بنانا چاہتے ہیں۔ یہ فریب نفس اور فریب ابلیس ہے۔

بلاشبہ مسلمان صوفیاء، تاجروں اور علماء نے اپنی دعوتی سرگرمیوں سے کروڑوں لوگوں کو مسلمان کیا لیکن آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ان کی پشت پر ایک کامیاب تہذیب مینارۂ نور اور کوہ گراں کی طرح کھڑی تھی اور اگر ایک لڑکی نے بھی سندھ کے پانیوں میں 'وامعتصما'' کہہ کر خلیفہ کو پکارا تو دمشق میں معتصم یہ آواز سن کر لبیک کہتا ہوا تلوار سونت کر کھڑا ہو گیا اور اس وقت تک نہیں بیٹھا جب تک محمد بن قاسم نے راجہ داہر کی اینٹ سے اینٹ نہ بجادی۔

خلاصہ یہ کہ ہم ڈاکٹر فاروق صاحب سے متفق ہیں کہ ہمیں تعمیر فرد اور اشاعت اسلام کے لیے دعوت وتبلیغ و اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔ مسلم معاشرے کے اندر بھی اور غیر مسلم معاشروں میں کام کرنے کے لیے بھی۔ اس کے لیے مسلم معاشرے کے دینی اور مخیر افراد، جماعتوں اور حکومتوں سب کو حصہ لینا چاہیے اور منصوبہ بندی کے ساتھ ہر سطح پر موثر کام کرنا چاہیے لیکن اس کا تقاضا ترک جہاد نہیں ہے

اور نہ جہاد کا یہ تقاضا ہے کہ ہم دعوت و اصلاح کے کام سے دست بردار ہو جائیں بلکہ ہمیں توازن کے ساتھ دونوں کام کرنے ہیں۔ ہمیں دعوت و اصلاح کا کام بھی کرنا ہے۔ مسلم ریاست کی اصلاح کے لیے سیاسی جدوجہد بھی درکار ہے۔ ہمیں دینی مدارس اور جامعات کی بھی ضرورت ہے۔ ہمیں لیبارٹریوں میں تحقیق بھی کرنا ہے اور اگر کوئی ہم پر چڑھ دوڑے تو ہمیں اپنی جان و مال اور عزت بچانے کے لیے جہاد بھی کرنا ہے۔ ان مختلف کاموں میں کوئی تضاد نہیں۔ یہ سب دینی احکام ہیں۔ ایک ہی پھول کی مختلف کلیاں ہیں۔ مسلم معاشرہ ماضی میں یہ سارے کام کرتا رہا ہے اور آج بھی کر سکتا ہے اور ان میں سے کوئی کام ایسا نہیں جو دوسرے کی قیمت پر کیا جائے و آخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین۔

دینی منہج عمر جاوید (کراچی)

دینی سیاسی جماعتوں کے لیے لمحۂ فکریہ

موجودہ ادارتی ڈھانچے کے ذریعے اسلام آ ہی نہیں سکتا

'کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے' کے فلسفے کی نسبت سے ہمارے ملک کی مذہبی سیاسی جماعتوں میں اس بات کا رجحان پایا جاتا ہے کہ ملک کے اداروں میں اپنے نظریے کے لوگوں کو داخل کر کے ان اداروں سے کچھ خیر کی امید رکھی جا سکتی ہے۔ جیسے جیسے ان اداروں میں دین دار لوگوں کا اضافہ ہوتا چلا جائے گا ویسے ویسے وہ ادارہ یا ادارے شر سے پاک ہوتے چلے جائیں گے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ویسے تو جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام کے لوگ ایک دوسرے کے مدمقابل نظر آتے ہیں لیکن اس نظریے پر متفق ہیں۔ جمعیت کی پشت پناہی کرنے والے علماء دیوبند بھی شائد اس نظریے سے اتفاق کرتے ہیں۔

بظاہر تو اس نظریے کی ابتداء پاکستان بننے کے بعد مولانا مودودی اور مفتی محمود کی تحریک سے ہوتی نظر آتی ہے لیکن کچھ غور کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دراصل سر سید احمد خاں تھے جنہوں نے اس نظریے کی داغ بیل ڈالی۔ اگر اس بات کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس نظریے کی عمر کوئی ۱۵۰ سال ہو جاتی ہے۔ اس پورے عرصے میں اس نظریے سے اتفاق کرنے والوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے اور

آج ایک بہت بڑی تعداد یہ سمجھتی ہے کہ نیک اور ایمان دار لوگوں کو مختلف ریاستی اداروں کا حصہ بنا کر ان اداروں کو شر سے پاک کیا جا سکتا ہے۔

اگر ہم یہ دیکھیں کہ پچھلے 66 سالوں میں مذہبی جماعتوں نے جو تگ و دو کی ہے۔ اس کے نتیجے میں ریاستی اداروں میں کتنے فیصد ان کے ہم خیال لوگ پہنچے ہیں اور ان لوگوں نے ان ریاستی اداروں کو شر سے پاک کرنے میں کتنی کامیابی حاصل کی ہے؟ اور کیا آج یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ہم اسی طرح چلتے رہے تو اگلے ۲۰ یا ۴۰ یا ۶۰ سالوں میں ان شاء اللہ کچھ مثبت تبدیلی آنے کے امکانات ہیں؟ زمینی حقائق کی روشنی میں ان باتوں کا جواب شاید مثبت نہ ہو۔ بلکہ اس بات کے زیادہ شواہد موجود ہیں کہ ان اداروں کے مرہون منت معاشرے میں شر آج اور زیادہ تیزی سے پھیل رہا ہے، اور اگر اس کا مقابلہ کوئی کر رہا ہے تو آٹے میں نمک کے برابر وہ مخلص لوگ نہیں جو ان ریاستی اداروں میں کام کرتے ہیں بلکہ روایتی دینی جماعتیں یا ادارے ہیں مثال کے طور پر تبلیغی جماعت اور مساجد وغیرہ۔ یہاں سوال یہ ہے کہ اگر پاکستان کی ۶۶ سالہ تاریخ میں اس نظریے کے صحیح ہونے کے ثبوت موجود نہیں تو آج ان مذہبی جماعتوں کے قائدین ایک لمحہ رک کر یہ کیوں نہیں سوچتے کہ یہ نظریہ اور طریقہ کار شاید ٹھیک نہیں اور کسی متبادل کی ضرورت ہے؟

اس مضمون میں ہم یہ دیکھیں گے کہ نہ صرف یہ نظریہ مغالطہ آرائی پر مبنی ہے بلکہ اس پر بلا سوچے سمجھے عمل کے نتیجے میں وقت اور افرادی قوت کے ضائع ہونے کی صورت میں قوم کو نا قابل تلافی نقصان بھی ہو رہا ہے۔ راقم کی نظر میں اس کی بنیادی وجہ مندرجہ ذیل مفروضات ہیں جو مذہبی جماعتوں نے انگریزوں کے بنائے ہوئے ریاستی اداراتی ڈھانچے کے بارے میں فرض کیے ہوئے ہیں۔

مفروضہ ۱: ایک ادارہ ایک اوزار کی طرح ہوتا ہے اور اسے استعمال کرنے والا اسے مثبت یا منفی طریقے سے استعمال کر سکتا ہے۔

مفروضہ ۲: ایک ادارے کا ماحول اس میں کام کرنے والوں پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

مفروضہ ۳: جس طرح کوئی بھی فرد یا گروہ ایک ہجوم کا حصہ بن سکتا ہے، اسی طرح کوئی بھی اپنی مرضی سے کسی بھی ادارے کا حصہ بن سکتا ہے اور ادارہ کسی قسم کی کوئی مزاحمت نہیں کرتا۔

مفروضہ ۴: ایک ادارے کا کوئی تاریخی پس منظر نہیں ہوتا اور وہ دوسرے اداروں سے الگ تھلگ ہو کر کچھ بھی کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔

مفروضہ ۵: ادارے کے اعلی حکام بالخصوص اس بات پر قادر ہوتے ہیں کہ وہ ادارے کے اندرونی نظام میں اوراس کی نظریاتی بنیادوں میں بلا روک ٹوک تبدیلی کرسکیں۔

مفروضہ ٦: ادارے کے اندر کام کرنے والوں کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ وہ ادارے کو اپنے نظریات کے مطابق ڈھالنے کی منصوبہ بندی کریں اوراس منصوبے کو عملی جامہ بھی پہنائیں، اور کسی بھی قسم کی تبدیلی کو ادارہ اور تمام اسٹیک ہولڈرز بخوشی تسلیم بھی کرلیں۔

کوئی شخص جس نے کسی بھی ادارے میں کام کیا ہو وہ ان مفروضوں کو بے بنیاد قرار دے سکتا ہے۔ کچھ تفصیل کے ذریعے یہ بات ان شااللہ مزید واضح ہوجائے گی۔

کسی بھی معاشرے میں سماجی ، معاشی اور ریاستی ادارے معاشرے کی ضروریات اور نظریات کے مطابق ایک تاریخی عمل کے ذریے وجود میں اتے ہیں اور مسلسل ارتقائی مراحل سے گزرتے رہتے ہیں۔ برصغیر میں جو معاشی اور ریاستی ادارے کام کررہے ہیں وہ سب کو معلوم ہے کہ انگریز اپنے ساتھ لےکرآے اور برصغیر کے عوام پر زبردستی مسلط کیے۔ پاکستان میں ابھی تک یہی ادارے برائے نام کام کررہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ادارے مسلمانوں کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی ضروریات اور نظریات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے اہل نہیں ۔سوال یہ ہے کہ ان اداروں میں جن تبدیلیوں کی ضرورت ہے کیا وہ مذہبی جماعتوں کے گمان کردہ درج بالا طریقے سے آسکتی ہیں؟

اس کے جواب میں کچھ تفصیل بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ کسی بھی ادارتی نظام کے لیے ضروری ہے کہ وہ کچھ اصولوں پر چلتا ہو اوراس میں کام کرنے والے ان اصولوں کے پابند ہوں۔ ان اصولوں کے مطابق ادارے کی داخلی اور خارجی پالیسی مرتب ہوتی ہے۔ یہ اصول ادارے، اس کے شعبوں اور اس میں کام کرنے والے ملازمین کی کارکردگی جانچنے کا پیمانہ بھی بتاتے ہیں۔ اس اصولی ڈھانچہ کا ارتقا ایک تاریخی عمل کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اوپر سے لے کے نیچے تک ہر شخص پر ان اصولوں کی پابندی لازمی ہوتی ہے اور خلاف ورزی پر وہ سزا کا مستحق بھی ہوسکتا ہے، اور اگر خلاف ورزی سنگین نوعیت کی ہو تو اس شخص کو نوکری سے فارغ بھی کیا جاسکتا ہے۔ ادارے میں ہر ملازم کی ذمہ داریوں کی حدود کا دائرہ بھی اسی اصولی ڈھانچے کا حصہ ہوتا ہے، تمام ملازم اپنی حدود میں رہ کر کام کرتے ہیں اور کسی دوسرے کی حدود میں قدم رکھنا ایک غلط بات سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی ملازم اپنی حدود سے تجاوز کرکے کسی دوسرے ملازم کے دائرہ کار میں دخل اندازی کرے تو ممکنہ طور پر اس کے خلاف بھی ادارہ کاروائی کرسکتا ہے۔ ہر ملازم کی اخلاقی ذمہ داری بھی اس کے کام کے حدود تک ہی محدود ہوتی ہے، اور وہ کسی دوسرے ملازم کی کسی بھی غیر

اخلاقی حرکت کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ ادارے میں بھرتی یا ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ ملازم ادارے کے اصولی ڈھانچے اور نظریات پر کامل یقین رکھ کر ان کے مطابق چلنے پر تیار ہو، اگر نہیں تو اس کو نوکری ملنا مشکل ہوتا ہے، اور اگر مل بھی جائے تو کچھ عرصے کے بعد اس کو نوکری سے فارغ کر دیے جانے کا امکان ہوتا ہے۔ ادارے کا نظام ہر ملازم کی کارکردگی اور اصولوں کی پابندی کا ریکارڈ رکھتا ہے۔ سیاسی جماعتوں کی رکنیت بھی شاید انہی اصولوں پر قائم ہوتی ہے۔

ایک اور بات سمجھنا ضروری ہے کہ ادارے میں کام کرنے والے کا ادارتی کردار اور اس کا انفرادی کردار دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ادارتی کردار کا تعلق ان ذمہ داریوں سے ہوتا ہے جو اس ملازم کو سونپی جاتیں ہیں یا وہ ملازم اس ادارے میں اپنی ملازمت کے تحفظ کی وجہ سے مجبور ہو کر سرانجام دیتا ہے۔ ان ذمہ داریوں کو سرانجام دینے کے لیے ملازم اپنی انفرادی حیثیت میں پوری ایمان داری سے کام کرتا ہو، لیکن ان ذمہ داریوں کے حق و باطل ہونے کا اس کی ایمانداری سے کوئی تعلق نہیں۔ مثال کے طور پر ایک بینک کا ملازم پوری ایمان داری سے سودی لین دین کر سکتا ہے، ایک پارلیمنٹ کثرت رائے سے پوری ایمانداری کے ساتھ قرآن اور سنّت کے خلاف بل پاس کر سکتی ہے یا اسلامی نظریاتی کونسل کی رائے کے خلاف انسانی حقوق کا بہانہ بنا کر اپنی بات منوا سکتی ہے، کوئی اشتہار بنانے والی کمپنی میں کام کرنے والا اپنے کلائنٹ کی خواہش کے مطابق پوری ایمانداری سے فحاشی سے بھرپور اشتہار بنا سکتا ہے، اور وکیل پوری ایمانداری کے ساتھ اپنے مجرم موکل کے لیے کیس لڑ سکتا ہے۔ کسی بھی ملازم کی ترقی کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ اپنے اس ادارتی کردار کو پوری ایمانداری سے نبھائے۔ ایسا کئی دہائیوں تک کرنے کے بعد وہ ملازم ترقی کرتے کرتے ادارے میں اعلیٰ حکام کی سطح تک پہنچتا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ادارے کے اندر اپنی ملازمت کے تحفظ کے لیے ہر ملازم کو کرپشن، افسر شاہی، دھاندلی، اور سفارشی کلچر کا حصہ بننے کی ضرورت پیش آتی ہو۔ اور اگر یہ تمام خرافات ادارے کے سسٹم یا نظام کا حصہ بن چکی ہوں تو ملازمت کے تحفظ کے لیے اور بالخصوص ترقی کے لیے ان تمام کالے کرتوتوں کا حصہ بننا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت حال میں جو ملازم ترقی کرتے کرتے اوپر پہنچ جائیں اور یہ تمام خرافات اس کے ایمان اور کردار کا حصّہ نہ بنیں یہ کسی معجزے سے کم نہیں۔ ایسی صورت حال میں یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہونی چاہیے کہ اگر کوئی ایماندار اور مخلص شخص کسی کرپٹ نظام میں داخل ہوگا تو اوپر پہنچتے پہنچتے یا تو خود کرپٹ ہو جائے گا یا پھر نظام اس کو کسی غیر موثر پرزے کی طرح بے دخل کر دے گا۔

ایک ادارہ کسی جاندار کی طرح اندرونی اور بیرونی خطرات سے دفاع کے لیے ایک مدافعتی نظام

کا حامل ہوتا ہے اب اگر کوئی ایسا گروہ جو نظریاتی طور پر اس ادارے کے متضاد ہو وہ اس ادارے میں داخل ہونا چاہے تو ادارہ لازمی طور پر اپنے دفاع کے لئے ہر ممکن کوشش کرے گا، اور اگر یہ گروہ کسی طرح اس ادارے کے اوپر حاوی ہو جائے اور اپنی مرضی کے مطابق اس ادارے کا رخ بدل دے، بھلے یہ جائز طریقے سے ہی کیوں نہ ہو، دوسرے ادارے اس ایک ادارے کو بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ مصر میں اخوان کو دوسرے اداروں نے جس طرح راستے سے ہٹایا ہے اس کی مثال سب کے سامنے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کے ہر ادارہ دوسرے ادارے سے اس طرح منسللک ہوتا ہے جیسے ایک مشین کے مختلف پرزے. اس انگریز کے بنائے ہوئے نظام میں ہر ادارے کو اپنی بقا اور مالی مفاد کے لیے دوسرے اداروں کی ضرورت ہوتی ہے، اور دوسری طرف کوئی بھی ادارہ کسی بھی دوسرے اداروں پر حاوی نہیں ہوسکتا۔ بالخصوص ایک ایسا ادارہ جو نظام کے مالی مفاد کی راہ میں رکاوٹ ہو۔

اس خصوصیت کی وجہ یورپ کی مخصوص تاریخ ہے جہاں ایک بہت لمبے عرصے تک بادشاہت اور پاپائیت کے آمرانہ نظام نے یورپ کو پسماندگی کے اندھیروں میں دھکیلے رکھا۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے جو تحریکیں چلیں انہوں نے بعد میں جو نظام مرتب کیا اور پوری دنیا میں استعماری (کولونیل) دور میں پھیلایا اس نظام میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ کوئی بھی گروہ یا فرد پورے نظام پر حاوی نہ ہونے پائے.

اب اگر کوئی یہ کہے کہ حاکمیت صرف اور صرف اللہ کی ذات کی ہے اور اس کے بعد اس کے آخری نبیؐ کی ہے، اور اس کے بعد ائمہ اربعہؒ کی ہے، اور پھر اس کے بعد علماء اور فقہا کرام کی ہے اور وہی تمام اہم فیصلے کریں گے اور پارلیمنٹ سمیت تمام ادارے علماء کرام کے آگے اپنا سر تسلیم خم کریں گے مثلاً قوم پر اور افواج پر جہاد کب فرض ہوگا؟ میڈیا کہاں تک آزاد ہوگا؟ اور بنکاری کا سودی نظام چلے گا یا نہیں؟ تو یہ سب کچھ انگریز کے بنائے ہوئے اس نظام کو برداشت نہیں کہ ایک طبقہ، اور وہ بھی فطرتاً مذہبی، تمام اداروں پر حاوی ہو جائے۔

مسلمانوں کی تخلیقی صلاحیتیں پاکستان بننے کی ابتدا میں شاید اس قابل نہیں تھیں کہ وہ ایک نیا نظام مرتب کرتے چنانچہ انہوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد انگریزوں کے چھوڑے ہوئے ریاستی نظام کو کلمہ پڑھانے کو کوشش کی۔ قائداعظم نے ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک ریکنسٹرکشن بنایا لیکن ان کے انتقال کے بعد یہ خواب ہی رہ گیا. اس کے بعد قرارداد مقاصد کو پاکستانی آئین کا حصہ بنانے کی کوشش بالکل صحیح تھی جیسے کسی بس کے آگے ایک پنکھا لگا کر یہ سمجھ لیا جائے کہ اب بس اڑنے کے قابل ہوگئی ہے۔ کیا اس پنکھے والی بس کا ڈھانچہ اس بات کی اجازت دیتا ہے کے ایک انتہائی تجربہ کار پائلٹ کی موجودگی میں بھی وہ جہاز

کی طرح اڑنا شروع کردے۔

انگریز کا بنایا ہوا یہ نظام ایک مشین کی طرح ہے جو کہ انسان نما پرزوں سے چلتا ہے۔ان پرزوں کو بنانے کے لیے جس فیکٹری کی ضرورت ہوتی ہے اسے اسکول، کالج اور یونیورسٹی کہتے ہیں۔انگریز جب اس نظام کو برصغیر میں لے کر آئے تو انہوں نے دوسرے اداروں کے ساتھ پورا تعلیمی نظام بھی متعارف کروایا۔اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ اس فیکٹری کی پروڈکٹ ذہنی اور قلبی طور پر اس قابل ہو کہ وہ مشین کے پرزے کی طرح بلا چوں چرا اس نظام کا کارآمد حصہ بننے کو ہی زندگی کا مقصد سمجھے۔اس بات کو ممکن بنانے کے لیے کالجوں وغیرہ کا نظام بھی کچھ اسی طرح مرتب کیا گیا کہ ہر فرد ایک ہی فیلڈ میں مہارت حاصل کر پاتا ہے اور جب وہ نظام میں آ کر نوکری کرتا ہے تو اس کو دوسرے شعبوں اور اداروں میں کام کرنے والوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔یہ تعلیمی نظام لوگوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو اپنی فیلڈ سے آگے ابھرنے نہیں دیتا اور نہ ان کی ذہنی نشوونما اس طرح سے کرتا ہے کہ وہ اس پورے نظام کو سمجھنے کے قابل ہو سکیں۔نیز ان کی اخلاقی تربیت اور تزکیہ نفس وغیرہ کا بھی کوئی خاص اہتمام نہیں ہوتا۔

اکبر الہ آبادی نے اسی نظام کے بارے میں کیا خوب کہا کہ ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

کالج اور یونیورسٹی وغیرہ سے جو لوگ نکلتے ہیں وہ نچلی سطح سے مختلف اداروں کے مختلف شعبوں میں داخل ہوتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ بغیر کسی چیز پر تنقید کیے یا سوال اٹھائے ادارے کے نظریات اور کلچر کے مطابق کام کرتے کرتے اعلی سطح تک پہنچتے ہیں، بھلے وہ کلچر کرپشن، دھاندلی، افسر شاہی، سفارش اور خودغرضی سے بھرپور ہی کیوں نہ ہو۔

اب اگر کوئی جماعت اس نظام میں داخل ہو کر اس کو قابو کرنے کی کوشش کرے تو اس کی شروعات کہاں سے ہوں گی؟ کیا بیک وقت تمام اداروں کی اعلی سطح کی قیادت کو کسی طریقے سے تبدیل کیا جا سکتا ہے؟ اگر نہیں تو کیا ہر ادارے کی نچلی سطح سے داخل ہونے کی کوشش کی جائے یہاں چند سو یا چند ہزار لوگوں کی بات نہیں ہو رہی بلکہ لاکھوں لوگوں کی بات ہو رہی ہے، یعنی ہم پورے تعلیمی نظام کو اپنے نظریات کے مطابق تبدیل کرنے کی بات کر رہے ہیں، اب جو مشکلات کسی بھی ادارے کا حصّہ بن کر اس کو تبدیل کرنے کے حوالے سے پہلے بیان کی گئیں تھیں وہ تعلیمی نظام پر بھی حرف بحرف لاگو ہوتی ہیں۔

اب جو مذہبی سیاسی جماعتیں نظام کا حصّہ بن کر اس کو شر سے پاک کرنے کی بات کرتی ہیں، ان کے پاس پارلیمنٹ کا ایک ناکارہ حصہ بننے کا تو لائحہ عمل ہے لیکن دوسرے اداروں کو اپنے نظریات کے

تابع کرنے کا کوئی ممکنہ طریقہ موجود نہیں۔وہ شاید اس مغالطے میں ہیں کہ جب کبھی وہ معجزاتی طور پر پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو افواج، عدلیہ، بیوروکریسی، میڈیا، سول سوسائٹی، بنکاری نظام...... وغیرہ ان کے آگے سرِ تسلیم خم کر لیں گے۔ایسا سوچنے والے شاید احمقوں کی جنّت میں رہتے ہیں۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مذہبی سیاسی جماعتوں کی سیاست میں ناکام شمولیت کے نتیجے میں بدنامی دین کی ہو رہی ہے۔ایک عام آدمی جو مذہبی جماعتوں کے کارکنان کو ذاتی طور پر نہیں جانتا وہ ان جماعتوں کی سیاست میں شمولیت کی کوششوں سے یہی نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ان جماعتوں کے مقاصد میں اور دوسری سیکولر اور کرپٹ جماعتوں کے سیاسی مقاصد میں کوئی زیادہ فرق نہیں بلکہ مذہبی جماعتیں سیاست کے لیے اسلام کے نام کا ناجائز استعمال کر رہی ہیں۔انسان اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے،تو جب مذہبی جماعتیں معروضی طور پر کرپشن اور بددیانتی سے بھرپور سیاست کے میدان میں نظر آئیں گی تو ایک عام آدمی ان کے بارے میں مثبت گمان کیوں کر کرے گا؟ اور اگر یہ بات درست ہے تو اس بات کے اشاعت اسلام پر کس قسم کے اثرات مرتب ہوں گے اور ہو رہے ہیں؟ اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اس کے برعکس دین کی خدمات کے حوالے سے اگر برصغیر میں تبلیغی جماعت، دینی مدارس اور مساجد کے نیٹ ورک کی خدمات کو دیکھا جائے تو اس کی مثال نہیں ملتی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریز کے لادینی نظام سے ان روایتی دینی اداروں کا کسی قسم کا براہ راست کوئی تعلق نہیں لیکن یہ بھی درست ہے کہ ان روایتی دینی اداروں کا بہت سا کام جو کہ نظریاتی نوعیت کا ہے، ابھی کافی حد تک کرنا باقی ہے۔

اصل بات جو سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ حقیقی جنگ نظام سے نہیں بلکے ان سیکولر اور لبرل نظریات سے ہے جن کے اوپر انگریزی نظام کھڑا ہے۔نظام میں داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بنیادی سیکولر اور لبرل نظریات سے اتفاق کر لیا جائے۔یعنی کہ نظام میں شمولیت کے بعد تبدیلی یا انقلاب کا نعرہ بے معنی ہو جاتا ہے۔میڈیا اس نظریات کی جنگ میں سب سے اہم کردار ادا کر رہا ہے۔میڈیا کے برعکس دوسرے اداروں کا پاکستان کی اکثریت سے کوئی خاص رابطہ یا تعلق نہیں۔پاکستان کی اکثریت کی زندگی مسجد، مدرسے، روایتی بازار، جرگہ یا پنچایت، روایتی خاندان، وغیرہ کے گرد گھومتی ہے، اور ان کو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کہ کون حکومت میں ہے یا نہیں؟ وہ عام طور پر عدالتی نظام کا رخ نہیں کرتے، پولیس کی مدد حاصل نہیں کرتے یا گورنمنٹ کے ہسپتالوں اور اسکولوں کا بھی رخ نہیں کرتے کیوں کہ انہیں

معلوم ہے کہ ان کے اکثر مسائل کا حل ان اداروں کے پاس نہیں۔

اسٹیٹ بینک کی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں بینک اکاؤنٹ ہولڈرز کی تعداد پوری آبادی کا صرف دس فیصد یا اس سے بھی کم ہے۔ یہ وہ تمام لوگ ہیں جو اپنی ماہانہ تنخواہ بینک میں وصول کرتے ہیں، یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو ریاستی یا نجی اداروں میں ملازم ہیں یعنی کہ کل آبادی کا ۸۰ فیصد سے بھی کم اس ریاستی نظام سے اپنی معاشی ضروریات کے لیے براہ راست منسلک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ملک میں اکثریت ان ریاستی اداروں اور مارکیٹ سسٹم پر براہ راست انحصار کیے بغیر گزارا کررہی ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ پاکستان میں بہت سارے فلاحی ادارے اپنی مدد آپ کے تحت بغیر ریاستی مدد کے چل رہے ہیں، ان میں پاکستان کے مدارس مساجد کا نیٹ ورک اور تبلیغی جماعت جیسی تنظیمیں بھی شامل ہیں۔ میڈیا براہ راست اس روایتی نظام کی نظریاتی بنیادوں کو کمزور کرنے میں سرگرم ہے، اگر خدانخواستہ میڈیا اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب ہو گیا تو یہ عین ممکن ہے کہ چند سالوں میں مذہبی سیاسی جماعتوں کو اپنی نظریاتی سرحدوں کا دفاع کرنا بھی مشکل ہو جائے۔

چنانچہ کرنے کا ایک اہم کام یہ ہے کہ ان روایتی اداروں کو اور زیادہ مستحکم اور کارآمد بنایا جائے اور ان کے دائرہ کار کو مزید پھیلانے کے لیے مؤثر اقدامات کیے جائیں تاکہ وہ اس نظریاتی جنگ میں اپنا بھرپور کردار ادا کرسکیں۔ دوسری بات جو کرنے سے زیادہ سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ تاریخ میں ایسی بیش بہا مثالیں موجود ہیں جن میں ایک پرانا اور فرسودہ ریاستی ڈھانچہ کی جگہ ایک دوسرے ریاستی ڈھانچے نے لے لی ہو۔ مثال کے طور پر برطانیہ میں ابھی تک بادشاہ اور ملکہ موجود ہیں لیکن ان کا ریاستی امور میں اثر و رسوخ پر پارلیمنٹ کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ انگریز جب برصغیر میں آئے تو انہوں نے مغلیہ سلطنت کے نظام کے ساتھ اپنا نظام کھڑا کرنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ پرانے نظام پر حاوی ہو گئے یہاں تک کہ آج اس کا نام ونشان بھی باقی نہیں۔ چین میں بھی ۶۰ سال پہلے کچھ ایسا ہی ہوا۔ ان تمام مثالوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جب کوئی فرسودہ نظام کسی معاشرے میں جڑ پکڑ چکا ہو تو اس میں گھس کر اس کو تبدیل کرنے کی بجائے ایک نئے موثر نظام کی بنیاد رکھی جاتی ہے جو کہ آہستہ آہستہ پرانے نظام پر حاوی ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے لوگوں کی نظریاتی بنیادوں پر کام کیا جاتا ہے اور ایسے لوگ تیار کیے جاتے ہیں جو متبادل نظام کی بنیاد رکھنے میں مددگار ثابت ہوں۔ اگر دیکھا جائے تو سرکار دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی مدینہ جا کر ایک نئے معاشرے اور نظام کی بنیاد رکھی، لیکن اس سے پہلے انہوں نے ۱۳ سال مکے میں صحابہ کرامؓ پر محنت کی۔

پاکستان کی وہ اکثریت جس کا ذریعہ معاش انگریز کے فرسودہ نظام سے براہ راست منسلک نہیں،

ایک متبادل نظام کو کھڑا کرنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں، ایک ایسا متبادل جو مسجد، مدرسہ، روایتی بازار اور جرگہ سسٹم کو مزید بہتر، جامع اور کارآمد بنا کر کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذہبی سیاسی جماعتوں کا انتظامی ڈھانچہ اتنا لچکدار ہے کہ وہ اپنے لائحہ عمل میں اتنی انقلابی تبدیلی لے کر آ جائیں۔ اگر نہیں تو شاید وہ بھی اس مضمون میں بیان کی گئی خصوصیت کے حامل ہیں۔ اگر وہ اپنے اندر تبدیلی نہیں لا سکتے تو جہاں تبدیلی کی پوری قوم کو ضرورت ہے وہاں تبدیلی کیسے لے کر آئیں گے؟ فیصلہ ان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔

اے اللہ! اہل غزہ کی مدد فرما اور مسلمانوں کو بے حس، بے حمیت
اور بے دانش حکمرانوں سے نجات دلا۔

دینی منہج　　مولانا مفتی محمد اصغر ☆

اصلاح معاشرہ ۔ منہج اور طریق کار

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے، اس میں ہر طبقے کے متعلق ھدایات موجود ہیں کوئی طبقہ ایسا نہیں کہ جس کے بارے میں اسلام نے کوئی رہنمائی نہ کی ہو اب صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان اسلام سے رہنمائی حاصل کرنے کیلئے آمادہ ہو اور اپنا تعلق اپنے حقیقی خالق و مالک سے استوار کرے اور اپنی ہر خواہش کو رب تعالیٰ کے حکم کے سامنے قربان کر دے۔ آج ہمارے معاشرے کی یہ دگرگوں حالت کیوں ہے؟ ہمارے گھر کا ماحول غیر اسلامی کیوں ہے؟ ہمارے خاندان کا شیرازہ کیوں بکھر رہا ہے؟ اور ہمارا معاشرہ اصلاح کی شاہراہ پر کیوں نہیں چل رہا؟ اسکی وجہ صرف اور صرف دین اسلام سے دوری اور اصلاح معاشرہ کے پیغمبرانہ اصولوں سے انحراف ہے، ہمارے معاشرے میں جو لوگ دیندار سمجھے جاتے ہیں وہ بھی صرف اپنی ذات کی حد تک ہیں، خود صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں، دین میں سمجھ بوجھ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور گناہوں سے بچنے کا بھی اہتمام کرتے ہیں لیکن گھر کے ماحول کو بدلنے کی کوئی فکر نہیں اور اپنے اہل خانہ کو دین کی طرف لگانے کا بھی کوئی اہتمام نہیں، اسلامی تعلیمات نے انسان پر صرف اپنی اصلاح کی ذمہ داری عائد نہیں کی، بلکہ اپنے گھر والوں کی اصلاح کی ذمہ داری بھی اس پر ڈالی ہے، اپنی اولاد، عزیز و اقارب اور اپنے خاندان کو راہ راست پر لانے کا فریضہ بھی گھر کے سربراہ پر عائد کیا ہے، خود حضرات انبیاء علیھم السلام بھی اس فریضے سے مستثنیٰ قرار نہیں دیے گئے، حتیٰ کہ امام الانبیاء،

فخر الرسل حضرت محمد ﷺ کو نبوت سے سرفراز کرنے کے بعد اللہ تعالی کی طرف سے جو پہلا تبلیغی حکم دیا گیا وہ یہ تھا "وانذر عشیرتک الاقربین" (کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرایئے) عشیرہ کے معنی کنبہ اور خاندان کے ہیں یعنی تزکیر وترہیب اپنے گھر سے شروع کریں، چنانچہ اسی حکم کی تعمیل میں جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنے عزیز واقارب اور اپنے خاندان کو کھانے پر جمع کیا اور ایک مئوثر خطبہ ارشاد فرمایا''اے بنی عبد المطلب، مجھے اللہ کیطرف سے تمھارے حق میں کوئی اختیار نہیں، تم میرے مال میں سے جتنا چاہو مجھ سے لے لو، خدا کی قسم جو چیز میں تمھارے پاس لیکر آیا ہوں مجھے عرب میں کوئی ایسا جوان معلوم نہیں جو اپنی قوم کے پاس اس سے بہتر کوئی چیز لایا ہو، میں تمھارے پاس دنیا اور آخرت کی بھلائی لایا ہوں اور مجھے اللہ نے حکم دیا ہے کہ تم کو اسکی طرف دعوت دوں، تم میں سے کون ہے جو

☆ استاذ ومفتی جامعہ امدادیہ اسلامیہ، فیصل آباد

اس کام میں میرے ہاتھ مضبوط کرے اور اس کے نتیجے میں میرا بھائی بن جائے'' (تفسیر ابن کثیر ۳۵۱/۳)

اسی طرح ایک دوسری آیت میں اللہ تعالی نے مومنین سے خطاب کے ذریعے اسی بات کی تنبیہ فرمائی چنانچہ ارشاد ہے ـــ"یا ایھا الذین آمنو اقوا انفسکم واھلیکم نارا" اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل خانہ کو جہنم کی آگ سے۔ اسکی تشریح کرتے ہوئے مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیعؒ رقمطراز ہیں۔ لفظ اہلیکم میں اہل وعیال جن میں بیوی، اولاد، باندیاں اور غلام سب داخل ہیں اور بعید نہیں کہ ہمہ وقتی نوکر، چاکر، خادم بھی غلام باندیوں کے حکم میں ہوں۔ (معارف القرآن) اس آیت میں گھر کے سربراہ کو حکم دیا جارہا ہے کہ خود بھی دوزخ کے عذاب سے بچے اور جو لوگ اسکی تربیت وکفالت اور ماتحتی میں رہتے ہیں انکو بھی عذاب سے بچائے۔ چنانچہ جب یہ آیت نازل ہوی تو حضرت عمر بن خطابؓ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! اپنے آپ کو دوزخ سے بچانے کی فکر کی جائے یہ بات تو سمجھ میں آ گئی لیکن اہل وعیال کو کس طرح دوزخ سے بچائیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے اہل وعیال کو دوزخ سے بچانے کا طریقہ یہ کہ اللہ تعالی نے آپکو جن کاموں کے کرنے کا۔ حکم دیا ہے تم بھی ان کاموں کے کرنے کا اپنے اہل وعیال کو حکم دو اور جن کاموں سے اللہ تعالی نے منع کیا ہے تم بھی ان کاموں سے اپنے اہل وعیال کو منع کردو، یہ عمل انکو دوزخ کی آگ سے بچا سکے گا۔ حضرات فقہائے کرام نے فرمایا ہے یہ آیت ہرانسان پر ایک فرض عائد کرتی ہے کہ وہ اپنی بیوی اور اولاد کو فرائض

شرعیہ اور حلال وحرام کے احکام کی تعلیم دیں اور اس پر عمل کرانے کی عملی کوشش کرے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: انسان کا اپنی اولاد کو ادب سکھانا ایک صاع غلہ صدقہ کرنے سے بہتر ہے، نیز فرمایا: کسی باپ نے اپنے بچے کو اچھے ادب سے بڑھ کر کوئی ہدیہ نہیں دیا۔ (مشکوٰۃ ۴۲۳) ان دونوں احادیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اولاد کی تعلیم وتربیت پر کتنا زور دیا ہے انکی تعلیم وتربیت اور ادب سکھانے کو صدقہ کرنے سے افضل قرار دیا ہے، جب اولاد کی تربیت اچھی ہوگی تو ظاہر ہے کہ وہ والدین کیلئے سکون قلب اور نیک نامی کا باعث بنے گی۔ بعض حضرات یہ عذر بیان کرتے ہیں کہ ہم نے بہت کوشش کی اپنے گھر کے ماحول کو درست کرنے کی اور اپنی اولاد کو اچھی تربیت دینے کی لیکن زمانہ کی ہوا ہی ایسی چل پڑی ہے کہ اولاد ہماری وعظ ونصیحت کا کوئی اثر لینے کو تیار ہی نہیں اور نہ ہی ہماری بات پر کان دھرنے کو تیار ہے تو اسمیں ہمارا کیا قصور ہے؟ لیکن یہ خیال محض ایک دھوکہ ہے حقیقت کچھ بھی نہیں، سوال یہ ہے کہ آپ نے کتنی کوشش کی ہے کتنے اضطراب اور کتنے سوز دل کیساتھ انکو سمجھانے کی کوشش کی ہے؟ آپکی اولاد اگر جسمانی طور پر بیماری میں مبتلاء ہو جائے یا خدا نہ کرے آگ میں چھلانگ لگانے کی خواہش ظاہر کرے تو اسوقت آپ اپنے دل میں کتنی تڑپ محسوس کرینگے اور یہ تڑپ آپکو کیسے کیسے مشکل ترین مراحل سے گذرنے پر مجبور کرے گی لیکن یہ سب کچھ سہ لینے کا آپ میں حوصلہ موجود ہوگا اور آپ بے تاب ہوں گے کہ کب یہ گھڑی آئے کہ میں اپنے بیٹے کو صحت وعافیت کیساتھ دیکھوں اور یہ مشکل وقت ہم سے ٹلے، سوال یہ ہے کہ آپ نے کبھی اپنے بیٹے کو گناہوں کی چکی میں پستے دیکھ کر اس قدر پریشانی اٹھائی ہے اور اتنی تڑپ محسوس کی ہے جتنی اسکی بیماری کی حالت میں محسوس کی تھی؟ اگر آپنے اس قدر کوشش کر ڈالی ہے اور اتنی تڑپ محسوس کی ہے تو بلاشبہ آپ نے اپنا فرض بجا طور پر ادا کر دیا ہے اور آپکی کوشش کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائیگا، لیکن اگر معاملہ اسکے برعکس ہے یعنی آپ نے اتنی کوشش نہیں کی کہ جتنی کرنی چاہیے تھی یا آپ نے اتنی لگن اور کاوش کا مظاہرہ نہیں کیا جتنا دنیاوی بیماری پر کیا تھا تو بیشک آپکے انداز تربیت میں کوتاہی ہے، جب آپ دنیاوی معاملات میں اسکے ساتھ سختی کا برتاو کرتے ہیں تو کیا وجہ ہے دین کے معاملہ میں اتنی نرمی کیوں اختیار کی گئی کہ ایک دو دفعہ کہہ دینے یا چند بار ڈانٹ ڈپٹ پر اکتفاء کر لینے کو فرض کی ادائیگی سمجھ لیا گیا۔ جس ہمت وکوشش اور فکر ولگن سے آپ ان کے لیے روزگار تلاش کرتے ہیں اتنی ہی فکر ولگن اسکی اصلاح کیطرف کیوں نہیں کرتے۔ بہر نوع! اولاد کی تربیت واصلاح کیلئے سوز قلب، توجہ اور خشوع وخضوع کیساتھ دعا کیجیے اور ساتھ ساتھ انکی تعلیم وتربیت پر بھی بھرپور توجہ دی جائے تو بہت جلد اسکے ثمرات ظاہر ہو سکتے ہیں، جب ایک فرد اپنی اصلاح کیطرف پوری توجہ مبذول کریگا تو اس سے ایک اچھا معاشرہ وجود میں آیگا اور جب ایک معاشرہ اپنی صحیح راہ کیطرف چل پڑیگا تو دھیرے

دھیرے اسکے اچھے اثرات پوری قوم میں منتقل ہونگے اور پوری قوم میں اصلاح کا جذبہ بیدار ہوگا۔آخر میں معاشرے کی اصلاح کیطرف متوجہ کرتے ہوے حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کا درد دل ملاحظہ ہو ''اگر آپ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ آپکا دین برحق ہے اور مرنے کے بعد جزاوسزا کے مراحل پیش آنے والے ہیں تو خدا کیلیئے اپنی اولاد کو بھی اس جزاوسزا کے دن کے واسطے تیار کیجیے،اسے ضروری تعلیم دلوایئے ،اسکے ذہن کی شروع ہی سے ایسی تربیت کیجیے کہ اس میں نیکیوں کا شوق اور گناہوں سے نفرت پیدا ہو،اسکی صحبت اور اسکا ماحول درست رکھنے کا اہتمام کیجیے،اپنے گھروں کو تلاوت قرآن اور اسلاف امت کے تذکروں سے آباد کیجیے،گھر میں کوئی ایسا وقت نکالیے جس میں سارے گھر والے اجتماعی طور پر دینی کتب کا مطالعہ کریں ،اپنے ذاتی عمل کو ایسا دلکش بنایئے کہ اولاد اسکی تقلید کرنے میں فخر محسوس کرے،اپنے اہل وعیال اور اقارب واحباب کے حق میں اللہ تعالی سے دعائیں کیجیے کہ اللہ تعالیٰ انھیں صراط مستقیم پر گامزن ہونے اور رہنے کی توفیق عطا فرمائے''۔ان باتوں پر اگر خلوص دل سے عمل کرلیا جائے تو ہم اپنے گھر اور معاشرے کو ایک بہترین معاشرہ بنا سکتے ہیں۔اللہ تعالی ہم سب کو اسکی توفیق عطا فرمائے آمین۔

دینی تحریکیں

محمد رشید☆

اعتراض سے اعتراف تک کا سفر (۲)

5۔ اس کے بعد ہم نے ایک اہم سوال ان الفاظ میں اٹھایا کہ''بھلا بتایا جاسکتا ہے کہ مسلم اکثریتی علاقوں،خاص طور پر پاکستان میں،جس کے آئین میں''قرآن وسنت'' کی بالادستی اور حاکمیت کو تسلیم کیا گیا ہے،نظام کی وہ کون سی تبدیلی ہے جو مسلم جماعتیں بذریعہ انتخابات دوتہائی اکثریت حاصل کرنے کے بعد روبہ عمل نہیں لاسکتیں اور محض احتجاجی سیاست ہی کے ذریعہ سے لائی جاسکتی ہیں۔انتخابات میں حصہ لینے پر اسلامی تحریکوں پر جو جو فرد جرم عائد کی جاتی ہے مثلاً اخلاقی،ایمانی،شرعی امور میں مداہنت سے کام لینا،تعمیر سیرت وتزکیہ وتربیت اور دعوت دین سے غفلت برتنا،مروجہ سیاسی ہتھکنڈوں اور برائیوں کو اختیار کرلینا وغیرہ وغیرہ تو کیا بتایا جاسکتا ہے کہ احتجاجی سیاست یا''احتجاجی تحریک'' کے منہاج میں بالقوہ وہ کون سی خوبی ہے کہ اس کو اپنانے والی جماعتیں ان برائیوں سے محفوظ رہیں گی۔اسلامی جماعتوں کو غلبۂ اسلام بذریعہ انتخابی سیاست ناکامی کے جتنے امکانات ہیں کم وبیش

اتنے ہی امکانات ناکامی کے غلبہ اسلام بذریعہ ''احتجاجی سیاست''/غیر مسلح تصادم میں ہیں۔''

جناب عباسی صاحب کا مضمون ہمارے اس سوال کا بھی کوئی جواب عنایت نہیں فرماتا۔

6۔ طریق کار کی اس بحث کو مختصر کرتے ہوئے اور یہ عرض کرنے کے ساتھ کہ ''یہاں اس موضوع پر پیش کیے جانے والے تمام دلائل کا تجزیہ کرنا مقصود نہیں ہے۔ یہ موضوع ایک الگ تفصیلی مقالہ کا متقاضی ہے۔'' ہم نے اس بحث کو ان الفاظ میں سمیٹنے کی کوشش کی:

''ہم پاکستان میں رہنے والوں اور یہاں کی دینی جماعتوں کا اصل المیہ اور اصل روگ یہ ہے کہ ہم نفاذ اسلام اور غلبہ اسلام کے نعرے تو بہت لگاتے ہیں، اس پر تقاریر اور خطابات کرتے ہوئے بھی نہیں تھکتے، اس کے طریق کار پر مباحث اور مذاکرے منعقد کرنے میں بھی ہمیں بہت لطف ملتا ہے۔ ہم میں کچھ لوگ پورے جوش وخروش سے یہ منوانے میں سرگرم رہتے ہیں کہ اس دور میں اسلام کا نفاذ اور غلبہ صرف اور صرف بذریعہ ''انتخابات'' یعنی جمہوری عمل کے ذریعے ممکن ہے......بعض لوگ صرف قتال وجہاد کے ذریعہ اسے ممکن سمجھتے ہیں، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ محض دین کی ناقص تبلیغ سے یہ مرحلہ سر کیا جاسکتا ہے......جبکہ تنظیم اسلامی پورے جوش وخروش سے یہ منوانے میں اپنی صلاحیتوں اور اوقات کو

☆ abu_munzir1999@yahoo.com

ضائع کر رہی ہے کہ غلبہ اسلام صرف غیر مسلح تصادم یعنی ''احتجاجی سیاست'' کے ذریعے ممکن ہے۔ اور اس طریق کو دریافت کرنا اور اسے چند مزعومانہ ''ٹھوس'' دلائل سے مدون کرنا تنظیم اسلامی کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس زبانی جمع خرچ میں سب بے حد مگن اور بے حد مطمئن ہیں کہ وہ دین کی بہت بڑی خدمت سرانجام دے رہے ہیں جبکہ دین کا اصل کام اور دین کے اصل تقاضے......افراد کا تزکیہ، کردار سازی، ایمان واخلاق کی آبیاری، قول وفعل کے تضاد کا قلع قمع، صالح افراد کی بنیاد پر صالح معاشرے کی تعمیر کا کام، جسے سید مودودیؒ نے خالص قرآنی فکر کے تحت بالکل درست طور پر ''**عمومی تحریک اصلاح**'' کے نام سے ذکر کیا ہے، اس کٹھن مگر نہایت **بنیادی ومحوری** کام سے ہم مجرمانہ پہلوتہی اختیار کیے ہوئے ہیں۔

....جس کے بغیر قیامت تک نہ ہی اسلامی معاشرہ وجود میں آسکتا ہے اور نہ ہی غلبہ اسلام کا خواب شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے۔ اور بالفرض اس کے بغیر کوئی نام نہاد اسلامی حکومت قائم ہو بھی گئی تو وہ چند ہی دنوں میں ریت کی دیوار ثابت ہوگی۔ یہ وہ کام ہے جو اسلامی حکومت قائم ہونے سے پہلے بھی ضروری ہے اور اس کے قائم ہوجانے کے بعد بھی اس کام کی اہمیت اور ضرورت کسی طرح کم نہیں ہوتی بلکہ اسلامی حکومت کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اس فریضہ ووظیفہ کو ریاستی سطح پر

بجالائے۔لیکن ہم، ہماری قیادتیں اور ہماری دینی جماعتیں احیائے اسلام کے لیے انبیاء ورسل کی اتباع کرنے کی بجائے، اس جانگسل اور کٹھن فریضہ کی مسلسل، پیہم اور مرکوز ادائیگی کرنے کی بجائے، اس بھاری پتھر کو چوم کر ایک طرف رکھ دیتی ہیں اور''نفاذ اسلام کے لیے طریق کار'' کی مردہ، لایعنی اور بے کار بحثوں اور''زبانی جمع خرچ''میں اپنا اور اپنے پیروکاروں کا وقت برباد کررہی ہیں۔اس معاملہ میں تنظیم اسلامی کا رویہ باقی دینی جماعتوں کے مقابلہ میں اس لیے غلط تر ہے کہ تنظیم اسلامی اپنی اساسی تشخیص اوراساسی وبنیادی بیانات میں غیر مبہم اور ٹھوس الفاظ میں اس کا اعلان واظہار اس طرح کرتی ہے''۔اس کے بعد راقم نے تنظیم اسلامی کے اساسی لٹریچر میں سے اقتباسات پیش کیے۔

ہمارے اس دکھ کو بھی ذرۂ بے نشاں سمجھ کر اس کا کوئی جواب دینا جناب عباسی صاحب نے پسند نہیں فرمایا۔بلکہ اس کی بجائے راقم کے زیر بحث مضمون کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ''**موصوف کے پیش کردہ اہم اعتراضات کا جواب بحمد اللہ ہم نے دے دیا ہے۔البتہ ہماری رائے میں موصوف نے چند اور ضمنی اعتراضات بھی کیے ہیں۔**'' کیا راقم نہایت ادب سے یہ پوچھنے کی جسارت کرسکتا ہے کہ مذکورہ بالا ہمارے سوالات جن کا کوئی جواب محترم عباسی صاحب نے دینا پسند نہیں فرمایا کیا یہ محض''**ضمنی اعتراضات**''ہیں؟

محترم عباسی صاحب ہمارے 12 صفحاتی مضمون کے صرف ڈیڑھ صفحات پر محیط لفظ''انقلاب'' پر تنقید کے جواب میں اس لفظ کو منوانے میں کم وبیش اٹھارہ صفحات تحریر فرمانے کے باوجود قرآن وسنت سے اس''فسادی'' لفظ کے حق میں ایک بھی دلیل پیش نہیں فرماسکے۔نیز باقی دس صفحات پر محیط ہماری مذکورہ بالا مرکزی نوعیت کی معروضات (یعنی ایمان، اصلاح، تذکیر، تزکیہ اور کردار سازی پر صلاحیتوں کو مرکوز کرنے کے بنیادی ومحوری کام سے غفلت برتنے) کو''ضمنی اعتراضات'' کہتے ہوئے کترا کر نکل جاتے ہیں۔موصوف نے خلط مبحث کا مظاہرہ فرماتے ہوئے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ شاید ہمارے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ سید مودودی مرحوم''اسلامی تحریک''کو''انقلابی تحریک'' کا نام بھی دیتے ہیں۔اس کے بعد موصوف نے سارا زور لفظ''انقلاب''کو منوانے پر صرف فرمایا۔تیرہ سوسالہ اسلامی لٹریچر کے لیے ایک نہایت اجنبی، نامانوس اور قرآن وسنت کے ناپسندیدہ ترین لفظ''فساد'' کے ہم معنی لفظ''انقلاب''سے موصوف کی متعصّبانہ عقیدت اور وابستگی ہی کا نتیجہ ہے کہ اس لفظ پر ہماری تند وتیز تنقید کا اقتباس درج کرنے کے بعد موصوف ہمیں للکارتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ''جناب رشید صاحب اپنے الفاظ کی لاج رکھتے ہوئے کہ''جدید دنیا کا ہر ظالم اور آمر انقلاب کی صدا بلند کرتا ہے''مولانا مودودی کی ذات گرامی پر ان ناپسندیدہ القابات کی تہمت لگانے کی جسارت کریں گے؟''۔ہمارے جن الفاظ کو موصوف نے ناپسندیدہ القاب کا نام دیا ہے کیا وہ حقیقت کی ترجمانی نہیں

ہیں اور کیا سابقہ دوسوسالہ تجربہ اس بات پر گواہ نہیں ہے؟ اگر حقائق آپ کی پسند کے مطابق نہ ہوں تو کیا آپ اس سے آنکھیں بند کرلیں گے اور آپ کی آنکھیں بند ہونے سے کیا حقائق آپ کی پسند کے مطابق تبدیل ہوجائیں گے؟ ہمیں حیرت یہ بھی ہے کہ محترم جمیل الرحمن عباسی صاحب نے ان ''ناپسندیدہ ''القابات کی تہمت سید مودودیؒ پر لگانے پر ہمیں کیوں اکسایا ہے؟

ہم سید مودودیؒ کو نبی اکرم ﷺ کے دین ومشن کے عظیم ترین خادموں میں سے سمجھتے ہیں۔ انہیں بیسویں صدی میں دین رسول ہاشمی ﷺ کا ایک نہایت محترم محافظ اور داعی سمجھتے ہیں۔ ہماری نظروں میں سید مودودی علیہ الرحمہ بیسویں صدی کا وہ عظیم اور مظلوم ولی ہے، جسے ان کے نہایت محترم ومکرم معاصرین کی اکثریت نے پہچاننے میں ٹھوکر کھائی۔ یہ بات صحیح ہے کہ خامیوں اور خطاؤں سے سید مودودیؒ بھی مبرا نہیں تھے،ان سے اختلاف رائے کے حق کو تسلیم کرنے کے باوجود ہم انہیں بیسویں صدی کا ایک عظیم راست گو اور پاکباز انسان سمجھتے ہیں۔ سید مودودی مرحوم ومغفور کو جن حالات میں دین کا کام کرنا پڑا،وہ قرآن وسنت پر مبنی دعوت کے لیے نہایت کٹھن،اجنبی،مخالف اور ناموافق حالات تھے۔تحریک شہیدین کی ناکامی، ٹیپوسلطان کی انگریزوں کے ہاتھوں شکست، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندوستان کے مسلمانوں کی انگریز کے ہاتھوں شکست،پہلی عالمی جنگ کے نتیجے میں خلافت عثمانیہ کا خاتمہ، لیبیا،الجزائر،مصر،مراکش غرض ایشیا وافریقہ میں مسلمانوں کی مغربی اقوام کے ہاتھوں بدترین شکست،مغربی ملحدانہ مادہ پرستانہ فکر کا ہمہ گیر تسلط واستیلا، یہ وہ عوامل تھے جنھوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو بدترین فکری ہزیمت،مرعوبیت اور ذہنی شکست سے دوچار کردیا تھا۔اغیار تو اغیار خود مسلمانوں کی غالب اکثریت میں بھی ریاستی سطح پر اسلام کی بطور ایک راہنما قوت کا یقین بدترین شک اور شبہ میں بدل چکا تھا۔جمہوری انقلاب،اشتراکی انقلاب اور کمیونسٹ انقلاب نے ساری دنیا میں شور اور غلغلہ مچایا ہوا تھا۔جمہوری نظام کا نعرہ لگا کر مغربی اقوام ساری دنیا پر ٹوٹ پڑی تھیں اور اسلامی ریاستوں سمیت تمام ریاستوں کو ادھیڑ کر رکھ دیا گیا۔کمیونسٹ نظام نے روس سے نکل کر آدھے یورپ پر اپنے پنجے گاڑ دیے تھے۔''انقلاب اور نظام'' کے اس شدید شور میں کوئی شخص اسلامی وقرآنی اصطلاحات میں بات سننے کو تیار نہ تھا۔یہ وہ نہایت قاہر،کٹھن،مشکل اور نامساعد حالات تھے جن میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو قرآن وسنت کی خالص دعوت کو منوانے اور اسے تمام شعبہ ہائے زندگی پر غالب کرنے کی دعوت کے تعارف اور قبولیت کے لیے ''انقلاب'' اور ''نظام'' کے الفاظ کا سہارا لینا پڑا۔اور قرآن وسنت کے سیاسی ومعاشی احکام کے ملکی سطح پر نفاذ کے لیے ''انقلاب'' کے لفظ کو تکرار سے استعمال کرنا پڑا۔اپنے وقت اور حالات میں ایسا کرنا سید مودودی مرحوم کی ایک ناگزیر مجبوری تھی،ان حالات میں یہ طرزعمل اسلام کی اور انسانیت کی ایک بہت بڑی خدمت تھی۔ یہ درحقیقت (ایمان واسلام کے حوالہ سے) نہایت کمزور انسانوں کی

حفاظت کے لیے اور انہیں دورجدید کے بھیڑ کی کھال میں چھپے ہوئے ''بھیڑیوں'' کے (ایمان شکن) حملوں سے بچانے کے لیے ''کتوں'' کومعاون کے طور پر استعمال کرنا تھالیکن ۱۹۶۰ء کے بعد حالات بدلنا شروع ہوئے۔''انقلاب اور نظام'' کا بخار آہستہ آہستہ اترنا شروع ہوا تو روحانی بحران، اخلاقی زوال، کردار کا کھوکھلا پن اور قول وفعل کے تضاد کے مرض کی شدت نے اپنا احساس دلانا شروع کیا۔اب ضرورت تھی کہ اسلامی اخلاق وکردار کے زندہ نمونے تیار کرنے پر اپنی تمام تر صلاحیتوں کومرکوز کر دیا جاتا لیکن ایسا نہ کیا جاسکا۔یہ عین وہی وقت تھا جب مغربی تہذیب نامی ''بھیڑیا'' کی اصل شکل ظاہر ہونا شروع ہوگئی اور مغربی تہذیب کے اس بےلباس ''بھیڑیا'' کی کامل درندگی کی حقیقت انسانیت پرکھل رہی تھی اور انسانیت کے ''سچے ہمدرد وغمخوار اور خدا پرست کردار'' کی ضرورت کا نہایت شدت سے احساس ابھرنے لگا۔بیسویں صدی کے نصف آخر کے انسان کا روحانی بحران اور مذہب کی شدید پیاس جدید تہذیب کی چمک سے بیزاری کا سبب بن رہی تھی۔یہ عصر حاضر کی وہ need/demand اور تقاضا تھا جس کی تکمیل اسلام کی سچی ،سادہ،خالص ،بےآمیز اور ہرقسم کی بیرونی ملاوٹ سے پاک ایمانی، ربانی، قرآنی اور نبوی ﷺ تعلیمات اور اصل اصطلاحات کے فروغ،اس کی پیروی اور اس کے ذریعہ سے تعلیم وتزکیہ کی صورت میں ہوسکتی تھی۔مگرافسوس صدافسوس اسلامی تحریکوں کے کارکنان اور ذمہ داران کی غالب اکثریت ''انقلاب'' نامی بخار سے نکلنے کے لیے آمادہ ہی نہ تھی۔تاہم جلد ہی یعنی ۱۹۷۰ء کے عشرے میں اسلامی تحریکوں کے سوچنے سمجھنے والے طبقات کی طرف سے ''ایمان ویقین'' اور ''اخلاق وکردار'' کے قحط وفقدان کو شدت سے محسوس کیا جانے لگا اور ''انقلاب اور نظام'' کے کھوکھلے نعروں پر حد سے زیادہ انحصار بے زاری اور ناپسندیدگی کو جنم دینے لگا۔چنانچہ اسی کا اظہار تنظیم اسلامی کے تاسیسی اجلاس میں کیے جانے والے ''عہد'' اور اس ''عہد'' کی وضاحت میں ہمیں نظر آتا ہے۔اور اسی کا اظہار ''اسلام کی نشاۃ ثانیہ......کرنے کا اصل کام'' (از ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم) نامی کتابچہ میں کیا گیا۔

اس احساس اور اظہار کے باوجود اسلامی جماعتیں بشمول تنظیم اسلامی ایمان ویقین سے سرشار ''اخلاق وکردار'' کی افزائش میں کوئی قابل رشک کارنامہ سرانجام نہ دے سکیں اور نہ ہی اس بنیادی ترین کام پر کوئی مرکوز ترجیحی جدوجہد کی گئی۔حتیٰ کہ بیسویں صدی کے آخری عشرے تک پہنچتے پہنچتے لفظ ''انقلاب'' کا سحر مکمل طور پر ٹوٹ گیا۔یہی وجہ ہے کہ راقم نے اپنے زیر بحث مضمون میں عرض کیا کہ:

''دنیا کے کسی بھی خطے میں آج تک انقلاب کے نام پر کوئی مثبت تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ہر انقلاب پہلے سے موجود ظالم طبقہ کو نیست نابود کرکے دوسرے ظالم طبقہ کو اپنے اوپر مسلط کرنے پر منتج ہوا۔دو تین عشرہ پہلے لفظ انقلاب میں اگر کوئی معنویت اور کشش تھی بھی سہی تو آج کے انسان کے نزدیک یہ ایک فرسودہ، پٹاہوا اور لایعنی لفظ بن چکا ہے۔ہر گمراہ، ہر ظالم ہر جھوٹا سیاسی راہنما عوام کی

گردنوں پر سوار ہونے کے لیے اسی لفظ کا سہارا لیتا ہے۔ اور پھر انسانوں کے دکھوں اور تکلیفوں کا نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید متمدن دنیا کی دجالی تہذیبوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چمک کی وجہ سے انیسویں اور بیسویں صدی میں نوع انسانی پر راج کرنے والا یہ لفظ قرآن وسنت اور تیرہ سو سالہ تاریخ پر محیط اسلامی لٹریچر میں کہیں بھی مثبت معنوں میں استعمال نہیں ہوا۔ یہ لفظ آج اکیسویں صدی میں اپنی افادیت بری طرح کھو چکا ہے۔ لوگ اس لفظ میں چھپی ہوئی خون آشامی، درندگی، فساد، دجالیت، دھوکہ اور ''پیتے ہیں لہو دیتے ہیں درس مساوات'' کے بدبودار چھپے ہوئے چہرے کا شعوری یا لاشعوری طور پر ادراک کر چکے ہیں۔ ہماری رائے میں اکیسویں صدی میں غلبہ اسلام کے لیے کی جانے والی کسی بھی کوشش کے لیے بطور اصطلاح اور بطور سلوگن ''انقلاب'' کے لفظ کو اختیار کرنا......اس کوشش اور جدوجہد کو غیر سنجیدہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ طرزِ عمل درحقیقت طرزِ کہن پہ اڑنا، بدلتے ہوئے زمانہ اور حالات سے ناواقفیت، دین کی روح اور اس کے قالب کو داؤ پر لگائے بغیر اس کو بہتر سے بہتر اور خوبصورت سے خوبصورت تر الفاظ میں پیش کرنے کی صلاحیت کے فقدان کی غمازی کر رہا ہے۔''

صاحبو! اس واضح اظہار کے بعد جناب عباسی صاحب کی اس للکار کو ہم کیا نام دیں جس کا ذکر اوپر کی سطور میں کیا گیا ہے۔ کیا تنظیم اسلامی کی قیادت لفظ ''انقلاب'' اور ''غیر مسلح تصادم'' (احتجاجی سیاست) کے ساتھ اپنی تعصب کی حد تک پہنچی ہوئی عقیدت و وابستگی میں اس حد تک گرفتار ہو چکی ہے کہ وہ نہایت بور کر دینے والی اور اکتا دینے کی حد تک اس کی تکرار اور رٹ کو ہی اقامت دین کا کام سمجھنے لگ گئی ہے؟ اور اس کے خلاف پیش کی جانے والی ہر معقول اور قرآنی آواز کی مخالفت میں ''کانوں'' میں انگلیاں ٹھونس لینا کیا کوئی صحتمندانہ طرزِ عمل ہے؟

انقلاب کے مقابلے میں ''اصلاح'' کے مقدس قرآنی لفظ کو ترجیح نہ بنانے پر ہماری شکایت کو محترم عباسی صاحب جن الفاظ میں رد فرماتے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ ''البتہ قرآن پاک میں اصلاح کا لفظ شعیبؑ کے قول کے طور پر (الاعراف: 85: ہود 88) جبکہ ایک مقام (الاعراف: 56) میں خطاب الٰہی کے طور پر نقل ہوا ہے۔''

۲۔ ''البتہ نبی اکرم ﷺ کے لیے یا کسی اور نبی کے لیے یہ لفظ استعمال ہی نہیں ہوا۔''

۳۔ ''ہمارے علم کی حد تک نبی اکرم ﷺ نے بھی اپنے ارشادات میں یہ لفظ اپنے لیے استعمال نہیں فرمایا۔'' (ماہنامہ میثاق، جون 2014)

سطور بالا میں لفظ اصلاح پر محترم عباسی صاحب کی ''اعتراض نما علمی'' نگارشات کو انہی کے الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔ قرآن حکیم کی دعوت کا علمبردار ہونے کے باوجود اس طرح کی غیر علمی اور خلاف

قرآن گفتگو پر حیرت بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی۔

لفظ ''انقلاب'' سے اندھی عقیدت اور تعصب کی پٹی کو اتار کے جب ہم اس آیت کی تلاوت کرتے ہیں، جسے موصوف صرف ایک نبی سے منسوب قرار دے کر خفیف ثابت کرنا چاہ رہے ہیں تو ہماری روح کی گہرائیوں میں یہ قول اترتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:{وَلَا تُفسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اَصْلَاحِهَا(الاعراف۔۸۵)}۔ہم یہ سوال کرنے کی جسارت کر سکتے ہیں کہ زمین کی اصلاح کرنا اور اس کے بعد اس میں فساد برپا ہونے سے روکنا کیا صرف حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کی ذمہ داری تھی؟ کیا باقی سب اقوام اس قرآنی حکم سے مستثنیٰ ہیں؟ اگر یہ آیت صرف حضرت شعیب علیہ السلام کے حوالے سے درج ہوتی تو ''انقلابی ذہن'' کا لفظ ''اصلاح'' سے آنکھیں چرانے یا اس کی اہمیت گھٹانے کا کوئی نہ کوئی ''علمی'' جواز مانا جا سکتا تھا مگر حیرت ہے بغیر کسی معمولی فرق کے عین انہی الفاظ میں قیامت تک کے انسانوں کو نصیحت کی جارہی ہے کہ{وَلَا تُفسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اَصْلَاحِهَا}(الاعراف :56) جسے موصوف خطاب الٰہی کہہ کر آگے گزر جانا چاہتے ہیں۔اس مقام پر موصوف شاہ ولی اللہؒ کے اصول تفسیر کے اس اصول سے بھی آنکھیں چرا گئے ہیں جو ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم اپنے دروس میں اکثر سنایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اہم اور خاص ہدایات کو قرآن حکیم میں کم از کم دو دفعہ ضرور بیان فرمایا ہے۔ (جاری ہے)

استفسارات

مدیر البرہان کا مسلک کیا ہے؟

سوال: میں پچھلے سال سے البرہان کا قاری ہوں، ملی مجلس شرعی سے بھی واقف ہوں لیکن اس کے باوجود میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کا ذاتی طور پر مسلک کیا ہے اور معاشرے میں مسالک کی موجودہ تقسیم کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

جواب: بعض دینی مصالح کی خاطر راقم اس طرح کے سوالوں کا جواب نہیں دیا کرتا۔تاہم مختصراً عرض ہے کہ میں فقہی لحاظ سے مسلکاً حنفی ہوں لیکن اوائل عمر میں جماعت اسلامی سے تعلق اور سعودی عرب میں زیر تعلیم رہنے کی وجہ سے مجھ پر سلفی اثرات بھی ہیں۔پچھلے بیس سال سے تصوف کی مروجہ خرابیوں سے پاک ایک پابند شریعت صالح بزرگ سے اصلاحی تعلق بھی ہے جو حنفی دیوبندی نقشبندی ہیں

اوران کے پاس ہر مسلک کے لوگ تزکیۂ نفس کے لیے آتے ہیں۔

میرے نزدیک اصل اہمیت دین اوراس پر عمل کو حاصل ہے کہ یہی انسان کو رضائے الٰہی کی منزل تک پہنچانے کا وسیلہ ہے جب کہ مسلک تو ایک اجتہادی مکتب فکر ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں مسلک کو بے جا اہمیت دی جاتی ہے اوراسے علماء اورعوام میں انتشار و تقسیم کا سبب بنالیا گیا ہے۔اسی وجہ سے راقم اپنے مسلک کی بات کم ہی کرتا ہے اور ملی مجلس شرعی بنانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ مختلف مسالک کے علماء کرام کے درمیان اتحاد واتفاق کی فضاء پروان چڑھے،مسلک پرستی کے اثرات کم ہوں اور جدید مسائل پر علماء کرام متفقہ موقف اختیار کرسکیں۔ظاہر ہے صدیوں کا زنگ لمحوں میں اتارانہیں جاسکتا تاہم الحمدللہ! ملی مجلس شرعی کے مثبت اثرات معاشرے میں بتدریج بڑھ رہے ہیں۔

راقم اپنی محدود صلاحیتوں کے ساتھ جس دوسرے شعبے میں کام کررہا ہے۔وہ تعلیم کی اصلاح کا ہے کیونکہ قرآن حکیم کی رو سے تعلیم وتربیت 'یعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم' ہی وہ بنیادی ذریعہ ہے جو فرد کی تعمیر و تشکیل میں اہم ترین کردار ادا کرتا ہے اور جب فرد کی اصلاح ہوئے گی تو معاشرے اور ریاست کی اصلاح پر بھی اس کے مثبت اثرات لازماً پڑیں گے۔